منکرین حدیث کی جدیدیت: ماخذ دین پر اعتراض:

منکرین حدیث کا ماخذ دین پر بنیادی اعتراض یہ ہے کہ سنت وحدیث کو حجت ماننے کے باعث عالم اسلام میں متعدد فرقے رونما ہوئے۔ اگر امت صرف قرآن کو حجت تسلیم کرتی تو امت اس انتشار، تفرقے تقسیم سے محفوظ رہتی جس کا واحد سبب حدیث کو ماخذ قانون تسلیم کرنا ہے۔ اس موقف کو حافظ اسلم جیراج پوری نے مقام حدیث کے صفحہ ۱۴ پر تفصیل سے بیان کیا ہے:

ان [احادیث] کو دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں سینکڑوں فرقے بن گئے اور ملت کا شیرازہ بکھر گیا، سنیوں کی حدیثیں الگ ہیں اور شیعوں کی الگ، ہر فرقے نے اپنے مذہب کی تعبیر اپنے حسب منشاء روایات سے کی ہے، وہ صرف اپنی ہی حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسروں کی حدیثوں کو غلط، جب کہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے''۔] سوال یہ ہے کہ قرآن کو واحد ماخذ قانون ماننے والوں کے فرقے کیوں ہیں؟ وہ سب کسی ایک موقف پر کیوں جمع نہ ہو سکے؟

منکرین حدیث کے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں کہ خوارج، معتزلہ نے حدیث وسنت کو حجت تسلیم نہیں، انھوں نے اپنے آپ کو اہل قرآن قرار دیا اور قرآن سے براہ راست استدلال کیا اور حدیث وسنت سے احتراز برتا، لیکن اس کے باوجود ان کے اندر بے شمار فرقے پیدا ہو گئے، ہر فرقہ دوسرے فرقے کی تردید کرتا تھا۔ ان فرقوں کی تعداد بالترتیب ۲۷ اور ستر تک پہنچ گئی تھی۔ ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ وہ حق ہے باقی تمام باطل حتیٰ کہ تردید کے اس عمل کے نتیجے میں خوارج اور معتزلہ فرقے دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ گئے، ان کی پیروی میں جتنے فرقے بعد میں پیدا ہوئے وہ بھی ختم ہو گئے اور ان کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں رہ گیا۔ یہ فرقہ بندی کے خلاف تھے خود فرقہ فرقہ کیوں ہو گئے جب کہ یہ عاملین و حاملین قرآن تھے، سنت و حدیث ترک کر چکے تھے۔

اہل قرآن کے فرقے:

انیسویں صدی میں منکرین حدیث کی جدیدیت سرسید احمد خان، احمد دین امرتسری، خواجہ کمال الدین، عبداللہ چکڑالوی، حافظ اسلم جیراج پوری، غلام احمد پرویز، علامہ مشرقی، ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے ذریعے مختلف رنگ وروپ میں ظاہر ہوئی۔ یہ تمام حضرات قرآن کریم کو واحد ماخذ قانون تسلیم کرتے تھے اور حدیث وسنت کی حجیت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا اصولاً ان تمام افراد کے افکار اور ان کے مکاتب فکر کے طرز عمل میں یکسانیت ضروری تھی کیونکہ قرآن حکیم انتشار افکار سے نکال کر وحدت افکار اور وحدت امت تک پہنچاتا ہے اور حدیث وسنت کے نتیجے میں وحدت ختم ہوتی اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ یہ منکرین کا دعوی تھا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اولاً ان منکرین حدیث کے افکار وخیالات میں کوئی مماثلت نہیں حتیٰ کہ شاگرد واستاد کے افکار واعمال میں بھی دیرینہ مغائرت محسوس ہوتی ہے ان کے ہر فرقے میں ذیلی فرقے پیدا ہوئے، ہر ایک کا نقطہ نظر قرآن سے اخذ شدہ تھا اور ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ اس کا نقطہ نظر ہی درست قرآنی نقطہ نظر ہے۔ سوال یہ

ہے کہ قرآن کو ماخذ قانون تسلیم کرنے کے بعد منکرین حدیث کے درمیان فرقہ بندی کی لہر کا اصل سبب کیا تھا؟

منکرین حدیث کے درمیان شدید اختلافات کیوں؟

منکرین حدیث کے مکتبہ فکر کے ہر فلسفی اپنے پیش رو فلسفی کے نظام فکر سے مختلف نظام فکر پیش کرتا ہے جس کے نتیجے میں عبادات اور اعمال کی شکل وصورت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ایک فلسفی کا نظام فکر دوسرے فلسفی کے نظام فکر سے مختلف ہے بلکہ ان تمام فلاسفہ کے نظام فکر میں بنیادی نوعیت کے تضادات موجود ہیں۔ ان کے افکار میں ہم آہنگی نہیں ہے اور ان کی قرآنی فکر مسلسل ارتقاء پذیر رہتی ہے۔ ایک ہی مفکر کے یہاں تاریخ کے مختلف مرحلوں میں ایک ہی قرآنی آیت کا مفہوم کچھ ہوتا ہے دوسرے مرحلے میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ پرویز صاحب اور ان کے ہم نوا افراد کے درمیان ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالرسل ایمان بالکتاب اور ایمان بالآخرۃ سے لے کر صوم صلوٰۃ، زکوٰۃ، درود، قربانی اور متعدد دوسرے شعائر میں اختلاف ہی نہیں تضادات بھی موجود ہیں۔ اس کی تفصیلات افتخار احمد بلخی کی کتاب ''فتنہ انکار حدیث کا منظر پس منظر کی جلد سوم میں صفحات ۳۰۷ تا ۳۶۰ میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ یہ وہی صورت حال ہے جو فلاسفہ کو درپیش ہے اور جس کا اعتراف [Beyond the out sider] کے مصنف کولن ولسن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

There is not a single statement by any philosopher since Descartes that cannot be immediately contradicted by another statement of another philosopher or some time from the same one.

صرف صلوٰۃ کے معاملے پر منکرین حدیث کے اختلافات:

دین کو جب فلسفہ بنا دیا جائے اور دین کے ہر حکم کا عقل محض کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے تو دین کا انجام یہی ہوتا ہے جو منکرین حدیث کے ہاتھوں ہوا، اس کے برعکس تمام مسلمہ دینی مکاتب فکر میں اختلافات کے باوجود تمام بنیادی امور میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مذاہب عالم کی اخلاقیات میں بھی مشترکہ امور کثرت سے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ بیشتر محرف مذاہب اصلاً وحی الٰہی کی پیروی کرتے ہیں۔

اس روشنی میں جدیدیت پسند منکرین حدیث کے تضادات و اختلافات صلوٰۃ جیسے مسئلے میں ملاحظہ کیجیے جب کہ صلوٰۃ کے معاملے میں شیعہ سنی مکاتب فکر میں بھی بنیادی نوعیت کا کوئی اختلاف نہیں ہے، جزئیات میں کچھ مسائل الگ ہیں لیکن فرائض میں کوئی اختلاف نہیں۔

۱۔ سرسیدؒ پانچ نمازوں کے قائل تھے، عبداللہ چکڑالوی صاحب بھی پانچ نمازوں کے قائل تھے لیکن نماز میں اللہ اکبر کو شرک کہتے تھے، اور اس کی جگہ ان اللہ علیٰ کان کبیراً کا ورد کرتے تھے، سجدے کی حالت میں ایک گھٹنا اوپر رکھتے تھے۔

۲۔ عبداللہ چکڑالوی صاحب کے فرقہ اہل قرآن کے منحرف گروہ کے سربراہ مستری محمد رمضان تین وقت کی نماز کے قائل تھے ہر نماز میں صرف دو رکعت اور ہر رکعت میں صرف ایک سجدے کے قائل تھے۔

۳۔ عبداللہ چکڑالوی صاحب کے ایک اور منحرف گروہ کے سربراہ سید رفیع الدین ملتانی قرآن کریم کی روشنی میں صرف چار نمازوں کے قائل تھے ان کا موقف تھا کہ ہر نماز میں صرف دو رکعتیں قرآن سے ثابت ہیں اور دلیل یہ تھی کہ قرآن میں حالت جنگ وخوف میں ایک رکعت نماز کا حکم ہے لہٰذا ایک رکعت نصف نماز ہے تو حالت امن میں اصل نماز صرف دو رکعات ہے، محبوب شاہ گوجرانوالہ اور سید عمر شاہ گجراتی کی رائے بالکل مختلف تھی۔

۴۔ مولوی احمد دین امرتسری صاحب جن سے علامہ اقبال بھی بے حد متاثر تھے۔ منکرین حدیث کے علمی امام اور اصل پیشوا احمد دین امرتسری صرف دو نمازوں کے قائل تھے، نماز کو قرآن سے حجت نہیں سمجھتے تھے اسے رسول اللہ کے قابل تقلید اجتہاد کے طور پر قبول کرتے تھے۔

۵۔ غلام احمد پرویز صاحب نماز کی جگہ نظام ربوبیت کے قائل تھے لہٰذا انھوں نے کبھی نہ مسجد بنائی نہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے کی زحمت فرمائی۔ وہ نماز کی موجودہ حنفی شکل کو درست سمجھتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ مرکز ملت اس کی تعداد وغیرہ از سر نو مقرر کرسکتا ہے۔ ان کے حلقے بزم طلوع اسلام کے اجتماعات میں کبھی کسی کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

۶۔ اسلم جیراج پوری صاحب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو رسول اللہ کا متواتر اسوہ حسنہ سمجھتے تھے اور اس کی مخالفت کو قرآن کی مخالفت قرار دیتے تھے۔

۷۔ واضح رہے کہ اسلم جیراج پوری صاحب احمد دین امرتسری صاحب سے بے پناہ متاثر تھے، ان کا موقف تھا کہ احمد دین امرتسری کے مسلک سے اختلاف کرنا ممکن نہیں ہے جب کہ احمد دین امرتسری صرف دو نمازوں کے قائل تھے ''تعلیمات'' میں صفحہ ۱۵۶ پر اسلم جیراج پوری کا یہ موقف تحریر ہے کہ ''نماز متواتر اسوہ حسنہ ہے یقینی ہے اور دینی ہے اور اس کی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے۔ لیکن ان کا یہ موقف بھی عجیب تھا کہ احمد دین امرتسری صاحب کی دو نمازوں کے فلسفے سے اختلاف کرنا ممکن نہیں۔

۸۔ علامہ اقبال راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن اسلام کو سائنسی پیمانوں سے دیکھتے تھے لہٰذا وہ نماز کو نظم و ضبط کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ ''جس کی غرض وغایت یہی ہے کہ وہ نفس کو نیند اور مشاغل دنیوی کے اثرات سے محفوظ رکھے اور میکانکی جبر کی زنجیروں سے اس کو آزادی عطا کرے۔ [The Human Ego. His Freedom & Immorality, p.109] پرویز صاحب علامہ صاحب کی اس سائنسی فکر سے بہت متاثر تھے۔ اقبال کے خطبات میں علوم اسلامی سے عدم واقفیت کے باعث جو

اغلاط در آئی ہیں پرویز صاحب اس کے مداح تھے اور اقبال کے حوالے سے اپنے موقف کی سچائی کا دعویٰ کرتے تھے جب کہ اقبال نے اپنے مؤقف سے رجوع کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں مدیر صدق، علامہ سید سلیمان ندوی اور سہیل عمر کے بیانات اہمیت کے حامل ہیں۔

۹۔ حضرت علامہ مشرقی نماز کو پریڈ سے تشبیہ دیتے تھے تا کہ افواج اسلامی ورزش کے ذریعے چاق و چوبند رہیں ان کی صحت اچھی رہے اور وہ دنیاوی امور میں بہتر طور پر حصہ لے سکیں۔

۱۰۔ مصر میں منکرین حدیث کے سربراہ ڈاکٹر توفیق صدقی بھی صرف دو نمازوں کے قائل تھے۔

۱۱۔ ان تمام تضادات کو اگر کولن ولسن کے محولہ بالا اقتباس کی روشنی میں پرکھا جائے تو منکرین حدیث کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم نے صرف صلوٰۃ کو مثال کے طور پر لیا ہے اگر اسی طرح دیگر موضوعات کی بھی فہرست تضادات پیش کی جائے تو قدم قدم پر منکرین حدیث کے متضاد نقطۂ ہائے نظر ملتے چلے جائیں گے۔ کولن ولسن نے لکھا تھا کہ سقراط سے آج تک جتنے بھی فلسفی گزرے ہیں ہر ایک نے دوسرے کی تردید کی بلکہ خود فلسفی اپنے فلسفے کی تردید کرتے رہتے ہیں۔ کم وبیش یہی صورت حال منکرین حدیث اور فرقہ اہل قرآن کی ہے صرف ان کے فرقوں میں تضادات نہیں پائے جاتے بلکہ ان فرقوں کے بانیان کے افکار تضادات سے پر ہیں، مختلف مواقع پر یہ مختلف موقف اختیار کرتے ہیں۔

عبداللہ چکڑالوی پر پرویز صاحب کے اعتراضات:

غلام احمد پرویز صاحب سے جب اہل قرآن اور منکرین حدیث کے ان اختلافات کا جواب پوچھا گیا تو محض الزام تراشی کے وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے بجائے انھوں نے عبداللہ چکڑالوی کے فرقہ اہل قرآن پر اعتراضات وارد کر دیے، لیکن اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے کہ محض قرآن حکیم کو ماخذ قانون تسلیم کرنے کے بعد عبداللہ چکڑالوی کی گمراہ کن فکر کا ازالہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اور صلوٰۃ جو اس امت کا ''شعار ہی سہی'' اس کو کیسے ادا کیا جائے اس کا جواب پرویز صاحب کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ خالص قرآن سے احکام متعین کرتے ہیں لیکن ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔ ایسا کہنے والوں کو دراصل اس کا علم نہیں کہ فرقہ اہل قرآن نے کون سی باتیں، قرآن سے متعین کرنے کی کوشش کی اور ان میں باہمی اختلاف ہوا؟ قرآن نے جن امور کو اصولی طور پر بیان کیا ہے، یہ فرقہ ان کی جزئیات کو بھی قرآن سے متعین کرنے لگ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو باتیں قرآن میں ہوں ہی نہ، اگر کوئی انھیں بھی قرآن سے متعین کرنے بیٹھ جائے تو ان میں اختلاف نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ جو لوگ یہ بھی قرآن سے متعین کرنا چاہیں کہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں، ان میں اختلاف کے سوا اور کیا ہوگا؟ فرقہ اہل قرآن کی یہی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ خود

ناکام رہا اور اس کی وجہ سے قرآن بدنام ہوگیا''۔[طلوع اسلام، اپریل ۶۷ء: ص۳۴] پرویز صاحب کی اس توضیح سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ دینی احکام کی جزئیات قرآن میں نہیں دی گئیں انھیں قرآن میں تلاش کرنا فعل عبث ہے۔ دوسرے لفظوں میں پرویز صاحب نے یہ تسلیم کرلیا کہ جزئیات دین قرآن سے اخذ نہیں کی جاسکتیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کہاں سے اخذ کی جائیں۔ یہ سوال خود اپنا جواب ہے۔ پرویز صاحب حدیث وسنت کی حجیت کو رد کرنے کے لیے جتنے بھی دلائل پیش کرتے ہیں وہ حدیث سے اخذ کرتے ہیں، جو چیز قابل حجت نہیں وہ اپنے دفاع میں کیسے پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ پرویز صاحب کا تضاد ہے۔ حدیث سے اس استدلال کی بنیاد پر ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ ہم حدیث کے قائل ہیں لیکن یہ اعتراض صرف ان حدیثوں کے لیے ہے جو ان کے موقف کی تائید کریں۔ پرویز صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اگر نماز کی جزئیات قرآن سے متعین نہ کی جائیں تو سنت سے اور حدیث سے متعین ہوں گی پھر اس میں جو جزوی اختلاف ہوگا اس کا ازالہ کیسے ہوگا؟ حدیث وسنت کے وہ قائل نہیں لہٰذا نماز کے مسائل کے لیے کس سے رجوع کیا جائے گا؟ وہ نماز کی موجودہ شکل اور خاص طور پر حنفی شکل کو بالکل درست سمجھتے ہیں، اسے ملی شعار تسلیم کرتے ہیں، مذہبی فریضہ نہیں۔ حنفی طریقے کے مطابق نماز ادا کرنے کا اعلان کرتے ہیں لیکن اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ یہ نماز انھیں کس ذریعے سے ملی ہے؟ اس شعار پر تواتر سے عمل کا حکم کس نے دیا اور اس تواتر میں تبدیلی کس دلیل کی بنیاد پر ممکن ہے تمام اختلافی مسائل کا حل وہ مرکز ملت کی صورت میں پیش کرتے ہیں لیکن مرکز ملت تو ابھی تک قائم نہ ہوسکا تو کیا امت نماز ترک کردے یا انتظار مرکز ملت میں مبتلا رہے؟ پرویز صاحب مزید فرماتے ہیں:

''دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام احکام کی جملہ تفصیلات و جزئیات خود قرآن میں موجود ہیں۔[یہی دعویٰ پرویز صاحب کا ہے] اس کے لیے انھوں نے سب سے پہلے نماز کی جزئیات کو لیا۔ میں کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑے بغیر صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کی اس سعی نامشکور کا نتیجہ کیا نکلا۔ اس فرقہ کے بانی تھے۔ مولانا عبداللہ چکڑالوی [مرحوم] اور ان کے متبعین کا ایک گروہ لاہور میں مقیم ہے۔ ان دونوں نے نماز کی جزئیات اپنے دعوے کے مطابق قرآن کریم سے متعین کی ہیں اور ان کی دریافت کردہ جزئیات کی کیفیت بالکل مختلف ہیں: جہاں تک اذکارِ صلوۃ کا تعلق ہے، وہ بھی بالکل نرالے ہیں، اگرچہ وہ مشتمل ہیں قرآنی آیات ہی پر۔ اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جس قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں نماز کی جزئیات تک میں اس قدر اختلاف ہے تو اسے منزل من اللہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے تو سوچیے کہ اس کا کیا جواب دیا جاسکتا ہے؟ اور اگر یہ دونوں گروہ [مقتدی اور مقتدیٰ] آپس میں جھگڑے لگ جائیں اور ایک دوسرے پر الزام دھریں کہ اس نے قرآن کو صحیح نہیں سمجھا تو اس سے ایک اور اعتراض وارد ہوگا جو پہلے اعتراض سے زیادہ نہیں تو کم سنگین بھی نہیں ہوگا۔ معترض کہے گا کہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ کتابِ مبین [روشن کتاب] ہے اور اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے لیکن عملاً اس کی

کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکم میں تعداد تک کو بھی غیر مبہم انداز میں بیان نہیں کر سکا، وہ جس انداز سے تعداد بتاتا ہے اس سے ایک شخص پانچ وقت سمجھتا ہے اور دوسرا تین وقت، کوئی دو تین چار رکعتیں سمجھتا ہے تو کوئی صرف دو رکعت، کوئی دو سجدے سمجھتا ہے تو کوئی ایک۔ بسیط حقائق (Abstract Realities) کے متعلق تو انسانوں کا فکری اختلاف، قابل فہم ہوتا ہے کیونکہ انھیں تشبیہی انداز میں بیان کیا جاتا ہے، لیکن جس کتاب کا متعین احکام وقوانین کے متعلق یہ انداز ہو، اسے خدا کی کتاب سمجھنا تو درکنار [معاذ اللہ] انسانی تصانیف میں بھی کوئی قابل قدر مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔ [تفسیر مطالب الفرقان: جلد اول، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶] مسئلہ صرف نماز کا نہیں ہے اس کے سوا بھی بے شمار معاملات میں چکڑالوی صاحب نے ٹھوکر کھائی، خود پرویز صاحب نے سو سے زیادہ معاملات میں قرآن سے دو اور تین قسم کے مختلف متضاد باہم متصادم نتائج اخذ کیے۔ یہ کیسا قرآن ہے جو ایک ہی مسئلے کے دو مختلف حل بتاتا ہے۔ حالانکہ اس مسئلے کا سبب نعوذ باللہ قرآن نہیں، اہل قرآن کا انکار حدیث ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ منکرین حدیث جب قرآن کو صاحب قرآن کے بغیر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہر تاویل مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ایک نئی تاویل کا سبب بن جاتی ہے اور یہ الجھن بڑھتی چلی جاتی ہے جس کا انجام انکار دین ہوتا ہے۔

اہل قرآن کے مابین قرآن کی بین آیات میں اختلافات:

اہل قرآن اور طلوع اسلام صرف قرآن کو ماخذ دین سمجھتے ہیں لیکن ایک فرقہ قرآن سے اصول فروعات وکلیات وجزئیات اخذ کرتا ہے جب کہ دوسرا فرقہ [پرویز صاحب] صرف اصول وکلیات اخذ کرتے ہیں اور ان کی تشریح وتوضیح کے لیے کسی آنے والے مرکز ملت کا انتظار کرتے ہیں۔ اب اگر مرکز ملت موجود نہیں ہے تو ان اصول وکلیات کی تشریح کون کرے گا؟ اس بارے میں پرویز صاحب خاموش ہیں۔

[۱] مثلاً البقرہ آیت ۱۷۳ کی تشریح میں لحم خنزیر سے چکڑالوی صاحب نے غدود کا گوشت مراد لیا ہے۔ [تفسیر القرآن بالقرآن جلد اول ص ۱۳۶ ادارہ بلاغ القرآن]

پرویز صاحب کے خیال میں لحم خنزیر سے مراد خنزیر کا گوشت ہے۔ [مفہوم القرآن ص ۶۲]

[۲] المائدہ و ان کنتم جنباً فاطھروا کے معنی چکڑالوی صاحب کے یہاں [جب] سے مراد بدخوابی ہے۔ [تفسیر القرآن جلد سوم ص ۲۷]

پرویز صاحب کے یہاں حالت جنابت [ہم آغوشی کی رعایت سے] لغات القرآن ص ۴۴۲،

[۳] البقرہ آیت: ۲/۲۴۰ کی تشریح میں بیواؤں کے لیے وصیت کے حوالے سے چکڑالوی صاحب فرماتے ہیں لاپتہ شوہر کی بیوی ایک سال تک شوہر کے مال سے نان نفقہ حاصل کرے گی ایک سال کا انتظار فرض ہے۔ [تفسیر القرآن بالقرآن جلد اول ص ۱۹۶ تا ۱۹۷]

پرویز صاحب کے یہاں یہ نان نفقہ صرف بیوہ عورتوں کے لیے ہے۔ [مفہوم القرآن ص ۹۲]

غلام احمد پرویز صاحب نے صرف قرآن کو ماخذ قانون تسلیم کرنے کی جو وجوہات مختلف مواقع پر بیان فرمائیں وہ درج ذیل ہیں ان وجوہات کی روشنی میں ہم پرویز صاحب کے افکار کا عہد بہ عہد جائزہ لیں گے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی کہ پرویز صاحب کی فکر بھی مسلسل ارتقاء پذیر رہی ہے اور وہ واحد ماخذ قانون کی آیات سے مختلف زمانوں میں مختلف مطالب ومفاہیم اخذ کرتے رہے جب کہ قرآن کی روشنی میں کوئی اختلاف ممکن نہیں ہونا چاہیے۔

جعفر شاہ پھلواری کے نام ایک خط میں اعتراف فرماتے ہیں:

پرویز صاحب پہلے ذاتی ملکیت کے قائل تھے بعد میں ذاتی ملکیت کے قائل نہ رہے:

طلوع اسلام کے ابتدائی ایام میں میں نے روس کے خلاف ایک مضمون ضرور لکھا تھا اس وقت یہ بھی یاد نہیں کہ اس کے بنیادی خطوط کیا تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ میں اس وقت ذاتی ملکیت کے متعلق قرآن کی اس تعلیم کو ہنوز نہیں سمجھ سکا تھا جواب میرے سامنے آئی ہے۔اب تو آپ میری کتاب نظام ربوبیت میں دیکھیں گے میں ذاتی ملکیت کا قائل ہی نہیں رہا۔[ص۱۹۰، جریدہ جلد نمبر۲۹] پرویز صاحب کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی ہر آیت واضح ہے اور قرآن میں اس کی تفصیل وتشریح موجود ہے۔اس کے باوجود وہ قرآن کی بین تعلیم کو ہنوز نہیں سمجھ سکے جو بعد میں ان کے سامنے آئی اس کا مطلب یہ ہے کہ محض عقل کے سہارے قرآن کی بین تعلیمات اور مسلمات کو سمجھنا بھی ناممکن ہے جب تک صاحب کتاب سے رجوع نہ کیا جائے ورنہ گمراہی کا امکان ہمیشہ موجود ہے۔حتیٰ کہ پرویز صاحب جیسا مفکر قرآن بھی ایک زمانے میں ذاتی ملکیت سے متعلق قرآن کی روح نہ سمجھ سکا بہت بعد میں اشتراکیت کے مطالعے کے بعد ذاتی ملکیت کی آیات کا صحیح مطلب مفکر قرآن کی سمجھ میں آیا یعنی قرآن اپنی تشریح کے لیے صاحب قرآن جو مجسم قرآن تھے ان سے رجوع نہیں کرے گا لیکن قرآن اشتراکیت کا محتاج ہے۔

پرویز صاحب کے استاد حافظ اسلم جیراج پوری کا فرمان تھا کہ واقعی قرآن میں اختلاف ہے لہٰذا آیات قرآنیہ میں ازالہ اختلاف اور رفع تضاد کے پیش نظر ''نوادرات'' میں انھوں نے ''وہم تعارض'' کے عنوان سے بیس آیات میں تطبیق وتوافق کی کوشش کی اس کے برعکس ان کے شاگرد رشید غلام احمد پرویز کا موقف پڑھیے:

قرآنی معیار کے نتائج یکساں ہیں:

''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بھی مختلف تعبیریں ہوسکتی ہیں۔اس لیے غلط اور صحیح کے پرکھنے میں قرآنی معیار کے نتائج میں بھی فرق ہوسکتا ہے۔اس قسم کے اعتراضات، درحقیقت قرآن کو سند و حجت تسلیم نہ کرنے کے لیے گریز کی راہیں ہیں۔''[طلوع اسلام اگست ۷۳ء:ص۳۵]

قرآن کے ذریعے اختلاف پیدا ہونا ممکن نہیں:

''قرآن کریم اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ دیتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات

نہیں۔قرآن کے اس دعویٰ کے بعد یہ تسلیم کرنا کہ یہ مختلف فرقوں کو ایسے قوانین دیتا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف اور باہم دِگر متضاد ہیں، قرآن کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کے مترادف ہے اور کھلا ہوا کفر''۔[طلوع اسلام، مارچ ۷۸ء:ص۴۰]

''اگر خالص قرآن کو اتھارٹی تسلیم کرلیا جائے تو کوئی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوسکتا''۔

[اگست ۸۴ء:ص۱۴]

قرآن کی تعلیم بڑی واضح، بین اور تضاد و تعارض سے پاک ہے''۔[طلوع اسلام،۵۲،ص۴۲]

''قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ ''**ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا**'' ۔یعنی اگر قرآن خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ بالفاظِ دیگر، قرآن نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں، پھر اس نے یہ بھی کہا کہ میری تعلیم صاف اور واضح ہے اس میں کوئی پیچیدگی نہیں، ابہام نہیں، التباس نہیں، ریب نہیں، تشکیک نہیں''۔[طلوع اسلام، اپریل ۵۹ء،ص۸]

''یہ سمجھنا کہ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق جو کچھ قرآن میں آیا ہے اس کی متعدد تعبیریں کی جاسکتی ہیں، قرآن کی تعلیم سے ناواقفیت کی دلیل ہے یا اس پر پردہ پوشی کی کوشش ہے''۔[طلوع اسلام، اپریل ۵۹ء،ص۹] پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ پرویز صاحب نے تسلیم کیا کہ قرآن میں اختلاف ہے: [نعوذ باللہ اختلاف قرآن میں نہیں ہمارے فہم میں ہے]

''قرآنِ کریم کی تعلیم کا ایک حصہ وہ ہے جس میں اس نے انسانی زندگی کے لیے راہنمائی دی ہے [اور یہی حصہ اس کے بنیادی مقصد سے متعلق ہے] انھیں اصول حیات یا مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اصول و اقدار بالکل واضح اور متعین ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوسکتا، امور مملکت کا تعلق اسی گوشہ سے ہے۔قرآنی تعلیم کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق، حقائق کائنات اور مابعد الطبیعیاتی (Meta-Physics) مسائل سے ہے۔ان حقائق کو سمجھنے کا مدار انفرادی فکر اور بہ حیثیت مجموعی انسانی علم کی سطح سے ہے۔جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، یہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور کوئی شخص جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لے گا وہ انھیں اسی قدر زیادہ عمدگی سے سمجھ سکے گا''۔[مارچ ۸۵ء،ص۶] پرویز صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مابعد الطبیعیاتی حقائق وحی اور ذات نبوت کے سوا کسی ذریعے سے بے نقاب نہیں ہوسکتے۔فلسفہ کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ میں کوئی سائنس دان اور فلسفی مابعد الطبیعیاتی حقائق کا ادراک نہیں کرسکا۔ ماڈرن ازم نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ عقل کے ذریعے حقیقت [Reality] کو پائے گی لیکن پوسٹ ماڈرن ازم تک آتے آتے فلسفے سے مابعد الطبیعیاتی سوالات خارج ہوگئے۔امریکا کا سب سے بڑا فلسفی رچرڈ رارٹی کہتا ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے مابعد الطبیعیات کو ختم کر دیا ہے۔ مذہب کا کوئی امکان نہیں۔[رارٹی کا مکالمہ The Future of

Religion مرتبہ SANTIAGO ZADALA کولمبیا یونیورسٹی پریس] پرویز صاحب کا یہ موقف ثابت کرتا ہے کہ وہ جدید فلسفے اور جدید سائنس کے مباحث سے قطعاً ناواقف تھے۔ وہ ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم کے فلاسفہ کے نقطۂ نظر سے بھی واقفیت نہ رکھتے تھے اور چند مشہور انگریزی کتابوں کے اقتباسات سے استناد فرماتے تھے۔

''قرآن کریم میں جو مابعد الطبیعیاتی مسائل آئے ہیں، ان کے سمجھنے میں تو انسانی فکر میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن جن امور کا تعلق انسانی رہنمائی سے ہے [یہی قرآن کا بنیادی مقصد ہے]، ان میں وہ بالکل واضح اور متعین تعلیم پیش کرتا ہے، جس کی مختلف تعبیریں ہونہیں سکتیں۔ بشرطیکہ قرآن کو خود اس کے اپنے تجویز فرمودہ طریق سے سمجھا جائے''۔[طلوع اسلام،۷۳ء،ص۵۳]

قرآن میں تعبیر اختلاف ممکن نہیں:

آیات قرآنی کی تعبیر اس لیے مختلف ہوتی ہیں کہ ہر فرقہ، اس آیت کی تعبیر، اس روایت کی رو سے کرتا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے اور چونکہ ہر فرقے کی روایات مختلف ہیں، اس لیے ان کی رو سے قرآنی آیات کی تعبیر میں اختلاف ہوتا ہے''۔[فروری ۶۲ء:ص۱۳]

''تعبیرات کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے معتقدات اور مسلک کو اوپر رکھتا ہے اور ان کے تابع قرآن کا مفہوم متعین کرتا ہے''۔[طلوع اسلام، اگست ۶۲،ص۱۰]

بات یہ ہے کہ مختلف فرقے، اپنے اپنے ہاں کے احکام کو محکم مانتے ہیں اور قرآن کو کھینچ تان کر ان کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا نام رکھتے ہی ''قرآن کی تعبیرات''.....اگر قرآن کو محکم مان لیا جائے تو اس کے احکام کی مختلف تعبیریں ہونہیں سکتیں''۔[طلوع اسلام، دسمبر ۶۲،ص۱۹]

قرآن سے صحیح رہنمائی کے لیے انسان خالی الذہن ہو کر اس کی طرف آئے اور اس کے ہاں سے جو کچھ ملے اسے من وعن قبول کرلے خواہ یہ اس کے ذاتی خیالات رجحانات معتقدات اور معمولات کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔[طلوع اسلام، اگست ۶۱ء ص۴۷] پرویز صاحب یہ ثابت کر رہے ہیں کہ مختلف فرقوں اور امت کے مسلمہ مکاتب فکر میں اختلاف کی اصل وجہ حدیث وسنت پر ان مکاتب کا اعتماد تھا۔ اگر یہ مکاتب فکر صرف قرآن کو ماخذ قانون تسلیم کرتے تو اختلاف ختم ہوجاتا لیکن پرویز صاحب یہ نہیں بتا سکے کہ اہل قرآن اور منکرین حدیث میں دوسو سے زیادہ فرقے کیوں بن گئے۔ جب کہ یہ تمام فرقے صرف اور صرف قرآن کو واحد ماخذ قانون سمجھتے ہیں۔ قرآن وحدت افکار کا آئینہ ہے تو یہ وحدت ان فرقوں کے درمیان وحدت افکار کیوں پیدا نہ کرسکی؟ سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن کی تشریح جب بھی عقل سے کی جائے گی تو اختلاف ہوگا۔ اس اختلاف کا حل حدیث وسنت میں ملے گا اور اس کے باوجود وہاں بھی عقل کے استعمال کے باعث لازماً اختلاف پیدا ہوگا۔ لہٰذا اس اختلاف کا حل اجماع امت کے ذریعے تلاش کیا جائے گا۔ جہاں جہاں انسانی عقل استعمال ہوگی اختلاف ہونا فطری امر ہے۔ اس اختلاف کا حل صرف

جمہور کے پاس ہے جمہوریت کے پاس نہیں۔ [علامہ اقبالؒ جیسے فلسفی بھی اصطلاح جمہور کو جمہوریت اور پارلیمینٹ کا متبادل سمجھتے ہیں]

میرے افکار میں کوئی تضاد نہیں: پرویز صاحب

''میں نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا، ۱۹۸۰ء میں بھی وہی کچھ کہتا ہوں کیونکہ یہ قرآنی حقائق پر مبنی ہے اور قرآنی حقائق ابدی اور غیر متبدل ہیں.....قرآن کو حجت اور سند ماننے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور۔ قرآن کا متبع، نہ مداہنت کرسکتا ہے، اور نہ کسی سے مفاہمت''۔ [طلوع اسلام، دسمبر ۸۰ء: ص ۶۰] پرویز صاحب کا یہ نقطہ نظر بالکل غلط ہے صدق اور معارف میں ان کے بے شمار مضامین، خطوط منکرین حدیث کی تردید میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین اور خطوط کو پرویز صاحب نے بھلا دیا ہے لیکن یہ مضامین محفوظ ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایام جاہلیت کی بات ہے جب کہ کبھی نہیں کہا گیا ۱۹۳۸ء کے بعد بھی پرویز صاحب نے بیسیوں مرتبہ قرآن کے مختلف اور متضاد مطالب بیان فرمائے۔

''طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا، اور تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء سے اب تک مسلسل اور متواتر پابندیٔ وقت کے ساتھ جاری رہا۔ قرآنی رہنمائی اور علم انسانی کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں اور حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینا اس کا مشن ہے۔ اس کی اشاعتوں کے انبار میں سے آپ کوئی سے دو پرچے اٹھا لیجیے؛ جہاں تک قرآنی فکر کا تعلق ہے، آپ کو اس میں کوئی تضاد، کوئی تخالف نہیں ملے گا یہ اس لیے کہ قرآنِ کریم کی رو سے اس کے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، کوئی اختلاف نہیں۔ اس لیے جو کچھ قرآنی رہنمائی میں کہا جائے گا، اس میں بھی کوئی تضاد و تخالف نہ ہوگا''۔

[طلوع اسلام، جولائی ۸۴ء: ص ۳۳]

''قرآن کو سند اور حجت ماننے والا تو ساری عمر میں دو متضاد باتیں بھی قرآن کی سند سے نہیں کہہ سکتا۔'' [طلوع اسلام، اپریل ۶۷ء: ص ۵۸]

پرویز صاحب نے دعویٰ کیا کہ:

''۱۹۳۸ء میں قرآن سے جو کچھ میں نے بیان کیا ۱۹۸۰ء میں بھی وہی کچھ کہتا ہوں کیونکہ قرآنی حقائق ابدی اور غیر متبدل ہیں ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن کو سند اور حجت ماننے والا دو متضاد باتیں بھی قرآن کی سند سے نہیں کہہ سکتا''۔

اب اس دعوے کی اصل حقیقت خود پرویز صاحب کے تضادات افکار میں ملاحظہ فرمایئے: بے شمار مباحث اور موضوعات پر پرویز صاحب نے مختلف متضاد مؤقف اختیار کیا لیکن اعتراف نہیں کیا۔

پرویز صاحب: قرآنی فکر یا تضادات کا سیل رواں

[۱] وَالّٰتی تخافون نشوزھُنَّ فعظو ھن واھجُروھُنَّ فی المضاجِع واضرِ

بوھن فِان اطعنکم فلا تبغوا علیھنَّ سبیل ا[النساء:۳۴]

''جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انہیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو اور مارو۔ پھر اگر وہ مطیع فرمان ہو جائیں تو ان پر زیادتی کی راہ نہ تلاش کرو''۔

پرویز صاحب جنوری ۱۹۴۹ء میں قرآن کے تینوں احکامات کا مخاطب شوہر کو ٹھہراتے ہیں۔

مرد عورت کو مار سکتا ہے:

ذرا غور کرو، سلیم اگر عورت نیک سرشت اور شریف النفس ہوگی تو اس کے لیے یہ تنبیہ بہت کافی ہوگی۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکے، تو اس کی بھی اجازت ہے کہ اس پر سختی کی جائے۔ واضربوھن [تم انہیں مار بھی سکتے ہو]'' [طلوع اسلام، جنوری ۴۹ء:ص ۶۷]

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پرویز صاحب نے یہ نقطۂ نظر تبدیل کر دیا جبکہ ان کا دعویٰ تھا کہ قرآن کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے اس میں اختلاف ممکن ہی نہیں ہے۔ اب شوہر صرف بیوی کو نصیحت کر سکتا ہے خواب گاہ میں الگ رہنے اور مارنے کا اختیار شوہر سے چھین لیا گیا۔

عدالت عورت کو سزا دے سکتی ہے:

''لیکن اگر معاملہ اس سے نہ سلجھے تو پھر بات حکام تک جائے گی اب فیصلہ وہاں سے صادر ہوگا۔ عورت کا جرم ثابت ہو گیا تو ہلکی سزا تو یہ ہے کہ اسے ایک معینہ مدت کے لیے خاوند سے الگ کر دیا جائے اور انتہائی صورت میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے بدنی سزا دی جائے''۔ [طلوع اسلام، اکتوبر ۴۹ء:ص ۹۲]

۱۹۵۷ء میں اسی آیت کی ایک نئی تفسیر سامنے آئی اور تینوں احکامات جو شوہر سے نکل کر عدالت کو منتقل ہوئے تھے اب معاشرے کو منتقل ہو گئے۔

معاشرہ اصلاح و مصالحت کرائے:

آپ نے غور فرمایا کہ اس پہلے مرحلہ میں بھی قرآن کریم نے معاشرہ کے لیے تین مرحلے رکھے ہیں: اول انہیں چاہیے کہ وہ نصیحت اور سمجھا بجھا کر حالات کی اصلاح کی کوشش کریں اگر اس کے بعد بھی حالات درست نہ ہوں تو پھر شوہر کو وہ ہدایت کریں کہ وہ اپنی بیوی کو خواب گاہ میں تنہا چھوڑ دے اور اس سے الگ الگ رہے، اگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو پھر عدالت اگر ضروری سمجھے تو بیوی کو جسمانی سزا بھی دے سکتی ہے۔ اگر اس کے بعد وہ راہ پر آ جائیں تو پھر ان پر مزید کسی زیادتی کی ضرورت نہیں ہے۔'' [طلوع اسلام، فروری ۵۷ء:ص ۴۳]

مردوں کی حاکمیت:

آپ مردوں کی عورتوں پر حاکمیت تسلیم نہیں کرتے اور آیت **الرجال قوامون علی النساء** [۴:۳۴] پر ''طاہرہ کے نام خطوط'' کے ص: ۴۵ سے ص: ۵۸ تک طویل بحث کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ موجودہ تراجم وتفاسیر سب غلط ہیں۔ تراجم اس لیے غلط ہیں کہ وہ عربی تفسیروں کا سا مفہوم بیان کرتی ہیں اور عربی تفسیریں اس لیے غلط ہیں کہ وہ روایات کی تائید پر لکھی گئی ہیں اور روایات اس لیے غلط ہیں کہ وہ ظنی ہیں یقینی نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے جو صحیح مفہوم بیان فرمایا وہ یہ ہے کہ:

۱۔ اس آیت میں بات میاں بیوی کی ہے ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے عام مردوں اور عورتوں کی ہے اور مرد عورتوں کو صرف روزی مہیا کرنے کے کفیل ہیں ان پر حاکم نہیں۔

۲۔ اس آیت **فالصلحت** کے معنی نیک عورتیں نہیں بلکہ وہ عورتیں ہیں جن کی صلاحیتیں [روزی حاصل ہونے کے بعد] نشوونما پا رہی ہیں۔

۳۔ **قٰنتٰت** کے معنی خاوندوں کی فرمانبردار نہیں، بلکہ ان صلاحیتوں کو مصرف میں لانے والی ہیں۔

۴۔ **حفظت للغیب** کے معنی مرد کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی نہیں بلکہ اس جنین کی حفاظت کرتی ہیں جو ان کے رحم میں ہے۔

۵۔ عورتوں کی نافرمانی سے مراد اپنے خاوندوں کی نافرمانی نہیں، بلکہ اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال ہے۔

۶۔ نافرمانی کی صورت میں سمجھانے کا حکم خاوندوں کے لیے نہیں بلکہ معاشرہ کے لیے ہے۔

۷۔ انھیں بستروں میں علیحدہ چھوڑنے کا حکم ان کے خاوندوں کے لیے نہیں بلکہ یہ نظر بندی کی سزا ہے جو انھیں معاشرہ یا حکومت دے سکتی ہے اور

۸۔ نافرمانی سے باز نہ آنے کی صورت میں انھیں مارنے کا تعلق ان کے خاوندوں سے متعلق نہیں، بلکہ عدالت انھیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے۔ [طاہرہ کے نام خطوط، ص: ۵۷]

یہ تو آپ کا ایک بیان تھا۔ اب **واھجروھن فی المضاجع** کا دوسرا بیان مفہوم القرآن سے ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں کہ:

''تو اگلا اقدام یہ ہونا چاہیے کہ ان کے خاوند ان سے علیحدگی اختیار کر لیں اور اسی نفسیاتی اثر سے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں''۔ [مفہوم القرآن، ج: ۱، ص: ۱۸۹]

گویا مفہوم القرآن کے بیان نے ''طاہرہ کے نام خطوط'' کے پورے بیان کی تردید کر دی۔ وہ یوں کہ اگر اس جملہ میں ضمیر جمع مذکر غائب خاوندوں کی طرف ہے تو اس **فعظوھن** اور **اضربوھن** کی ضمیر بھی لامحالہ خاوندوں کی طرف ہی ہو سکتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہاں بات میاں بیوی ہی کی چل رہی ہے نہ کہ عام عورتوں اور عام معاشرہ یا حکومت یا عدالت کی۔

عمر نوح اور پرویز صاحب کے متضاد نقطۂ نظر:

سورہ عنکبوت کی آیت ۱۴ میں ارشاد ہوا کہ:

وَلَقَد اَرْسَلْنَا نُوْ حَا اِلَی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْھِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا

''ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے درمیان پچاس کم ایک ہزار سال رہا۔''

پرویز صاحب: عمر نوحؑ ساڑھے نو سو برس تھی

دور حاضر کے انسان کے لیے جو سوا سو سال کے عمر کے آدمیوں کو دور دور سے دیکھنے کے لیے آتا ہے اور نہایت حیرت و استعجاب سے ان سے ان درازی عمر کے راز دریافت کرتا ہے اتنی لمبی عمر مشکل باور کیے جانے کے قابل ہے۔ اس وجہ سے بعض حضرات عاماً 'سال' سے مراد مہینے لینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ لیکن حضرت نوحؑ، آدمؑ سے دسویں پشت میں آئے ہیں اور ان کے تمام اسلاف کی عمریں، آٹھ آٹھ، نو نو سو سال کی لکھی ہیں۔ لہٰذا ایک ایسے بعید ترین زمانے میں جب ہنوز انسان کے اعصاب دورِ حاضر کی برق آگیں تمدن اور رعد آمیز فضا کے مہلک اثرات کا شکار نہیں ہوئے تھے اور اسے ارضی و سماوی آفات کے مقابلے کے لیے قوی ہیکل جسم اور فولادی عضلات عطا کیے گئے تھے، اتنی لمبی لمبی عمریں کچھ باعثِ تعجب نہیں ہو سکتیں۔ [معارف القرآن: جلد دوم، ص ۳۷۶]

تاؤمت کے رشی کی عمر: بارہ سو سال

تاؤمت کا ایک بہت بڑا مبلغ اور رِشی (Kwang) [جس کی پیدائش چوتھی صدی ق م کی ہے] اپنی چوتھی کتاب میں سمجھاتا ہے کہ عمر بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم روبہ انحطاط نہیں۔'' (Sacred Books of the East, (Taoism) Translated by James Legge. (p.225) [معارف القرآن، جلد دوم، حاشیہ ص ۳۷۷]

لیکن جب معارف القرآن جلد دوم کو جوئے نور میں تبدیل کیا گیا اور مغرب معیار حق بن گیا اور عقلی کسوٹی پر عمر نوح عجیب لگی اور عہد حاضر کا انسان قرآن کے اس دعوے کو عجیب نظر سے دیکھنے لگا تو حالات و زمانہ کی رعایت سے مغربی انسان کو مطمئن کرنے کے لیے اس آیت کی تعبیر بھی بدل گئی۔ خود پرویز صاحب اعتراف کرتے ہیں:

مغرب سے مرعوبیت:

حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو اور تقلید لیکن زندگی کی محمود روش قرار پا چکی ہو ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لیے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ [سلیم کے نام ج ۳ ص ۱۵۱] اسلام کو سمجھنے کے لیے مغرب کی طرف رجوع کرنے کا دعویٰ عجیب و غریب دعویٰ ہے۔

نوحؑ کی عمر دو سو سال: پرویز صاحب

عربی ''لغت میں سنۃ کا اطلاق 'فصل' پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں یعنی چار فصلوں کا

ایک سال ہوتا ہے۔اس اعتبار سے الف سنۃ کے معنی ہوں گے کہ اڑھائی سو سال اور عام پورے سال کو کہتے ہیں۔اس لیے اگر خمسین عاما کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔'' [جوئے نور،ص۳۴]

پہلے حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو سال پر پرویز صاحب کو کوئی تعجب نہ تھا اب صرف دو سو سال پر اکتفا کر لیا گیا ایک ہی قرآن سے دو مفہوم اخذ کیے جا رہے ہیں جب کہ دعوی ہے کہ حدیثوں میں اختلاف ہے قرآن میں کوئی تضاد اختلاف نہیں۔

قوم نوح تکذیب حق کے باعث ہلاک کی گئی: پرویز

قومِ نوح کی غرقابی کے واقعہ پر سرسری مورخانہ نگاہ صرف اتنا بتا سکے گی کہ پانی کا بلا انگیز طوفان آیا اور [سوائے ان لوگوں کے جو کشتی میں سوار تھے] سب غرق ہو گئے۔ان کی بستیاں نذرِ سیلاب ہو گئیں۔سارے علاقے میں کوئی متنفس باقی نہ رہا۔جہاں اس شدت کا سیلاب آتا ہے ایسا ہی ہوتا ہے.....لیکن قرآن کریم زاویۂ فکر و نظر کو کسی اور طرح بدل دیتا ہے۔وہ یہ کہتا ہے کہ قومِ نوح نے دعوتِ حق وصداقت کی تکذیب کی اور ان کے جرائم کی پاداش میں ان کا استہلاک ہوا''۔

[معارف القران: جلد دوم،ص۳۷۰]

قوم نوح کا انجام بداعمالیوں کی وجہ سے نہ تھا: پرویز

''یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حوادث ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھے یا انہیں ان کی تباہی کا موجب بنا دیا گیا تھا؟ اس کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ آج بھی زلزلے آتے ہیں، آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں، سیلاب بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں، آندھیوں کے طوفان چلتی ہوئی ریل گاڑیوں کو اُٹھا کر دریاؤں میں پھینک دیتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ حوادث کسی قوم کی بد عملیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے۔'' [جوئے نور،ص۲۹]

''یہ حوادث نہ تو کسی قوم کے غلط اخلاقی اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے صرف بد اعمال لوگ تباہ ہوتے ہیں''۔[جوئے نور،ص۲۹]

قوم نوح کی غرقابی کا اصل سبب ''تکذیب حق'' اب ساقط کر دیا گیا۔پرویز صاحب کو اللہ تعالیٰ سے اختلاف ہو گیا ہے۔

منطق الطیر: پرندوں کی بولی: پرویز صاحب

قرآن کریم میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے تذکارِ جلیلہ میں یہ آیت بھی وارد ہوئی ہے:

''حضرت سلیمان [علیہ السلام] حضرت داؤد [علیہ السلام] کے وارث بنے اور کہا:
''اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے''۔[النمل:۱۶] [معارف القرآن جلد سوم

ص ۴۰۵] برق طور میں پرانا نقطۂ نظر مسترد کر دیا گیا۔

منطق الطیر: گھوڑوں کا لشکر

''منطق الطیر'' کے معنی پرندوں کی بولی نہیں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں [یعنی برق طور ہی میں ......] طیر سے مراد گھوڑوں کا لشکر ہے [جو حضرت داوؑد اور سلیمانؑ کے زمانہ میں بیشتر قبیلہ طیر کے افراد پر مشتمل تھا] اور منطق کے معنی اس قبیلہ کے قواعد وضوابط ہیں۔ لہذا اس سے مطلب ہے: ''گھوڑوں کے رسالہ کے متعلق علم'' یہ اس زمانہ میں بہت بڑی چیز تھی۔'' [برق طور: ص ۲۵۳ تا ۲۵۴]

منطق الطیر کے دو متضاد معانی قرآن کریم جیسی محکم کتاب سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جس کی آیات میں کوئی اختلاف ممکن ہی نہیں ہے۔

خذ االعفو: پرویز صاحب کا قدیم موقف

سورہ اعراف آیت ۱۹۹ میں خذ العفو کا مفہوم کیا ہے؟ قرآن کے الفاظ میں اے نبیؐ درگزر کر تارہ معروف کی تلقین کیے جا اور جاہلوں سے نہ الجھ۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں [بہر حال تم ان کی ان باتوں کی وجہ سے اپنے پروگرام میں رکو نہیں] تم ان سے درگزر کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ [مفہوم القرآن: ص ۳۹۰] پھر تفسیر مطالب القرآن میں خذ االعفو کی تعبیر تک لخت تبدیل ہوگئی یہ خیال بھی نہ رہا کہ یہ مکی دور کی وحی ہے۔

خذ العفو کا نیا پرویزی مفہوم:

العفو کا لفظ آیت [۲/۲۱۹] میں آیا ہے جہاں بالبداہت زائد از ضرورت معنی ہی موزوں ہیں۔ چنانچہ میں نے مفہوم القرآن میں یہی معنی لکھے ہیں اور مطالب الفرقان جلد سوم ص ۳۲۶ پر بھی اس کے مطابق وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد یہ لفظ زیر نظر آیت [۷/۱۹۹] میں آیا تو مجھے اپنی بصیرت کی رو سے اس کا دوسرا مفہوم یعنی درگزر کرنا موزوں دکھائی دیا۔ چنانچہ میں نے یہی ترجمہ مفہوم القرآن میں دے دیا [اس کا عام طور پر یہی ترجمہ کیا جاتا ہے] اس کے بعد ایک بحث کے دوران میں نے محسوس کیا کہ یہ مفہوم مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔ بالخصوص لفظ خذ کے پیش نظر جس کے معنی وصول کرنے یا لینے کے ہیں، اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی آیت [۹/۱۰۳] خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَةً اس کی موید تھی۔ اس غور وفکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آیت [۷/۱۹۹] میں بھی العفو کا وہی مفہوم زیادہ موزوں ہے جو آیت [۲/۲۱۹] میں دیا گیا ہے یعنی زائد از ضرورت مال۔ اس آیت میں اسلامی نظام [یا اس کے سربراہ حضور نبی اکرم ﷺ] سے کہا گیا ہے کہ جماعت مومنین کا زائد از ضرورت مال اپنی تحویل میں لے لیا کرو تا کہ اس طرح اجتماعی طور پر قرآن کا معاشی نظام قائم رہے۔ مفہوم القرآن [آیت ۷/۱۹۹] کے مفہوم میں ترمیم اس کے نئے ایڈیشن میں کر دی جائے گی۔ البتہ اس دوران میں تبویب القرآن میں عفو کے عنوان کے تابع یہ مفہوم دے دیا گیا ہے''۔ [تفسیر مطالب الفرقان: ج ٦، ص ۵۵] پرویز صاحب نے یہ تسلیم کر لیا کہ قرآن

کی آیات میں غور وفکر سے اس کے نئے نئے مفہومات معلوم ہوتے رہتے ہیں اور ایک ہی آدمی مختلف کیفیات مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں قرآن کی بین آیات سے مختلف قسم کے مطالب اخذ کرسکتا ہے۔

پرویز صاحب کا غلط موقف:

عفو کا معنی زائد از ضرورت مال صرف وہاں لینے کی گنجائش ہوتی ہے جہاں اس کا مالی خرچ یا مال سے متعلق ہونے کا کوئی قرینہ موجود ہو۔ جیسا کہ آیت [۲/۲۱۹] میں لفظ ینفقون میں یہ قرینہ موجود ہے۔ لیکن آیت زیر بحث الاعراف ۱۹۹ میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ یہ آیت مکی ہے جس کا خیال پرویز صاحب نے نہیں رکھا۔

لغت سے قرآن مرتب کرنے کا انجام:

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ پرویز صاحب کے فکری ارتقاء کا ایک اور نمونہ پیش کرتے ہیں یہ انجام ہے سنت کے بجائے لغت سے قرآن مرتب کرنے کا قرآن صرف صاحب قرآن کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے اور اصحاب رسول کے عمل سے

۱۔سماء بمعنی	آسمان	(م۲:۱۷۹)	۱۔ارض بمعنی	زمین	(م۲:۱۷۹)
۲۔ //	بلندی	(نظام:۱۱)	۲۔ //	پستیاں	(م۲:۲)(۳:۲۱۹)
۳۔ //	آسمان کی بلندیاں	(م۳:۵۳۴)	۳۔ //	زمین کی پستیاں	(م۳:۵۳۴)
۴۔ //	ابتداء یا انتہائی پست نقطہ	(نظام۶) (م۲:۶)	۴۔ //	کائنات کی پستیاں	(نظام۴، ۱۲۔۱۳۔۴۸)
۵۔ //	حدنگاہ		۵۔ //	معاشی زندگی	(نظام:۸۶)
۶۔ //	سماوی کرے۔اجرام سماوی یا فلکی	(م۳:۵۳۴)	۶۔ //	وسائل پیداوار	
۷۔ //	کائنات کی بلندیاں	(نظام ۴، ۱۲۔۱۳۔۴۸)	۷۔ //	معاشی پروگرام	(نظام:۱۱۶)
۸۔ //	خدا کا کائناتی قانون	(نظام:۸۶)	۸۔ //	معاشرہ	(نظام:۱۱۹)
۹۔ //	عمرانی زندگی	(نظام:۱۱۸)	۹۔ //	دنیا	(نظام:۲۴۵)
۱۰۔ //	آفاقی دنیا	(نظام:۲۴۹)	۱۰۔ //	معاشی پیداوار کا ذریعہ	(نظام:۲۴۵)
۱۱۔ //	خارجی کائنات	(نظام:۲۸۱)	۱۱۔ //	معاشی مفاد پرستیاں	(نظام:۲۳۳)
۱۲۔ //	کائناتی قانون	(نظام۲۸۲)	۱۲۔ //	معاشی دنیا	(نظام:۲۴۹)

۱۳۔ //	کائناتی نظام	(نظام:۲۵۸)	۱۳۔ //	تمدنی زندگی	(نظام:۲۴۹)
۱۴۔ //	نظام ربوبیت	(نظام:۲۸۷)	۱۴۔ //	تمدنی اور معاشی زندگی	(نظام:۲۸۱)
۱۵۔ //	معاشرہ	(نظام:۲۸۷)	۱۵۔ //	تمدنی اور معاشی دنیا	(نظام:۲۸۲)
			۱۶۔ //	معاشی نظام انسانیت	(نظام:۲۸۵)

اور اگر سماوات اور ارض دونوں الفاظ کا یک جا مفہوم بتانا ہو وہ ہوگا۔ صرف ''نظام'' [نظام۔۲۸۵] اور انہی دونوں الفاظ کا تفصیلی معنی ہے'' کائناتی نظام''

ایک ہی قرآنی لفظ کے اس قدر مختلف اور متضاد مفاہیم بیان کیے گئے ہوں اور ایسے مفاہیم کسی عربی لغت سے ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتے۔

پرویز صاحب: قربانی کے قائل تھے

''لہٰذا اپنے پروردگار کے لیے نماز قائم کرو اور قربانی کرو''۔ [معارف القرآن:۳۶۹/۴]

لیکن ذہنی ارتقاء ہوا تو وانحر کا مفہوم قربانی کے بجائے کچھ اور ہو گیا۔

پرویز صاحب: قربانی کا انکار

''اب تیرے لیے ضروری ہے کہ تو اس کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے اس کے لیے تو اپنے پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہ۔ خدا کے نظام ربوبیت کے قیام کے لیے اپنے فرائض منصبی کو پوری طرح ادا کر، ان پر علم و عقل اور تجربہ و مشاہدہ سے پوری طرح حاوی ہو، اور اس کے ساتھ ہی اپنی جماعت کے لوگوں کے کھانے پینے کا بھی انتظام کر۔'' [مفہوم القرآن، ص ۱۴۸۸]

خط کشیدہ الفاظ وانحر کے مفہوم کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اسی صفحے پر حاشیے میں یہ عبارت ہے نحر اونٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں جب کہ یہ لفظ نحر نہیں بلکہ نحر ہے۔

آیت قصاص کا پرویزی مفہوم: قصاص

آیت قصاص کا مفہوم پہلے پرویز صاحب کی نظر میں قصاص ہی تھا۔

''پھر شریعت میں ایسی آسانیاں مل جانا جن سے قوانین ممکن العمل ہو جائیں رحمتِ خداوندی ہے، مثلاً قانون قصاص کی رو سے قتل کا بدلہ قتل ہے لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ

''اگر [قاتل کو] اس کے بھائی [مدعی] کی طرف سے معافی مل جائے تو [اس کے لیے] معقول طریقہ پر خون بہا کا مطالبہ ہے اور [قاتل کے لیے] خوبی کے ساتھ اس کا ادا کرنا۔ یہ [قانون دیت وعفو] تمہارے پروردگار کی طرف سے سختیوں کا کم کر دینا اور ترحم [خسروانہ] ہے.....''

[معارف القرآن، جلد اول، ص ۱۴۰]

فکر مغرب سے مرعوبیت کے بعد قصاص کے معنی بھی بدل گئے۔ قتل عمد میں دیت وعفو کا اختیار بھی اولیاء مقتول سے سلب ہو گیا۔

قصاص کا نیا پرویزی مفہوم: جرم کی سزا نہیں:

''قصاص: اس کے معنی 'جرم کی سزا' دینا نہیں، اس کے معنی ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ رہ جائے، یعنی قرآنی نظام میں کسی جرم کو Untraced نہیں رہنا چاہیے، وہ اس قسم کے محکم نظام تفتیش میں حیاتِ اجتماعیہ کا راز بتاتا ہے''۔[طلوع اسلام، اگست ۶۵ء:ص۱۲] اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ قتل عمد میں عفو و دیت ہے ہی نہیں یہ سہولت صرف قتل خطا سے مخصوص ہے۔

قتل عمد میں عفو و دیت نہیں: پرویز صاحب

''جرم قتل: قرآن نے قتل عمد [بالارادہ] اور قتل خطا [سہواً] میں فرق کیا ہے۔ قتل خطا کی سزا [یا یوں کہئے کہ کفارہ یا جرمانہ] ایک مومن غلام کا آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرنا ہے۔ وہ اس خون بہا کو معاف کر سکتے ہیں۔[۴/۹۲، ۹۳] واضح رہے کہ 'غلام آزاد کرنا، اس زمانے کی بات ہے جب عربوں کے ہاں غلام چلے آ رہے تھے، اسلام نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا ہے لہٰذا یہ نظام معاشرہ تجویز کرے گا کہ اس کی جگہ کیا کفارہ ادا کیا جائے گا۔

قتل عمد کے لیے دیت [خون بہا] نہیں، اس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کی سزا جہنم ہے اور اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اور بہت بڑی سزا [۴/۹۳]۔ میں اس وقت ان مختلف سزاؤں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، لیکن یہ واضح رہے کہ قتل عمد کی بھی مختلف نوعیتیں ہیں۔ ایک قتل سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوتا ہے اور ایک وقتی جوش میں آ کر وقتی طور پر [وغیرہ وغیرہ] اس اعتبار سے جرم کی سزا میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ قرآن کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدل کے تقاضے کی رو سے جرم قتل عمد کے لیے موت کی سزا بھی تجویز کرتا ہے۔ مثلاً ۲/۱۷۸، ۵/۳۵، ۱۷/۳۳

[ماہنامہ طلوع اسلام: اگست ۶۵ء:ص۱۴]

قتل خطاء میں قصاص نہیں ہے جب کہ قتل عمد میں قصاص دیت عفو کی رعایت ہے پہلے پرویز صاحب اس کے قائل تھے جدید یت اختیار کرنے کے بعد روایت سے ہٹ گئے۔

مال غنیمت: پرویز صاحب کا پہلا نقطۂ نظر

''غنیمت اور فے، دو اصطلاحات ہیں: مال غنیمت وہ جو مخالفین سے جنگ کے بعد حاصل ہو اور مال فے وہ جسے مخالفین جنگ کیے بغیر چھوڑ جائیں۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ، بیت المال میں جمع ہوگا اور باقی چار حصے سپاہیوں کو تقسیم ہوں گے، مال فے پورے کا پورا بیت المال میں جمع ہوگا''۔

[معارف القرآن: جلد چہارم، حاشیہ ص۶۲۴]

''اور جان رکھو کہ جو تمہیں مالِ غنیمت میں ملے، اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے، رسولؐ کے لیے، [رسول کے] قرابت داروں کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے نکالنا چاہیے [اور بقیہ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیے جا سکتے ہیں]، اگر تم اللہ اور اس [غیبی امداد] پر یقین

رکھتے ہو، جو ہم نے فیصلہ کر دینے والے دن، اپنے بندے پر نازل کی تھی، جب کہ دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے [تو چاہیے کہ اس تقسیم پر کاربند رہو، اور یاد رکھو] اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں''۔
[معارف القرآن، جلد چہارم، ص۶۲۴]

مال فے: پرویز صاحب کا جدید اور غلط نقطۂ نظر

جنگ کے سلسلے میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھو کہ اس سے پہلے تمہارا دستور یہ تھا کہ جنگ کہ جو کسی کے ہاتھ آ جائے وہ اس کا ہوا یہی لوٹ کا مال وہ بنیادی جذبہ تھا جس کے لیے تم میدان جنگ میں جایا کرتے تھے [نعوذ باللہ صحابہ کبھی جنگ مال کے لیے نہیں لڑتے تھے] لیکن اب جنگ ظلم کو روکنے، نظام عدل قائم کرنے کے لیے ہوگی اس میں جذبہ محرکہ لوٹ کا مال نہیں ہوگا۔''یاد رکھو، میدان جنگ میں جو مالِ غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات کے لیے رکھ کر باقی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا۔مثلاً [میدان جنگ میں جانے اور کام آ جانے والوں کے] اقرباء کے لیے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار تنہا رہ جانے والوں کے لیے ان کے لیے، جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو یا جو کسی حادثے کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں۔نیز ان مسافروں کے لیے جو مدد کے محتاج ہوں۔ [مفہوم القرآن: ص۴۰۴]

اشتراکیت: پرویز صاحب کا قدیم نقطۂ نظر

''اشتراکیت، ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام ہر شخص کی کمائی کو اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔زمانۂ ظہورِ اسلام میں جائیداد و املاک عموماً مویشیوں کی شکل میں تھیں، ان کے متعلق فرمایا:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَھُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا اَنْعَامًا فَھُمْ لَھَا مَالِکُوْنَ

''کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لیے دستِ قدرت سے مویشی پیدا کیے ہیں جن کے یہ لوگ مالک ہیں''..... جب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں، انسان کی ملکیت ہو سکتی ہیں تو انسان کی اپنی کمائی اور مصنوعات تو یقیناً اس کی ملکیت ہوں گی، ارشاد ہے: لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِیبٌ ممّا اکْتَسَبْنَ

''جو مرد کمائیں، وہ مردوں کا حصہ ہے اور جو عورتیں کمائیں، وہ عورتوں کا حصہ ہے''۔

اشتراکیت کے اُصولِ نفی ملکیت سے اسلام کا معاشی، تمدنی اور عمرانی ہر قسم کا نظام منہدم ہو جاتا ہے۔قرآن میں ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا

''قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا اور محتاج اور مسافر کو بھی، مال کو بے موقع نہ اڑانا''۔

ظاہر ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی، اس صورت میں ہو سکتی ہے جب کوئی چیز کسی کی ملکیت میں ہو

اگر ہر چیز غیر کی ملکیت میں ہو اور کمانے والے کو صرف اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے تو وہ دوسروں کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے۔

یہی حال، ترکہ اور وراثت کے احکام کا ہے جس پر ذاتی ملکیت کی [غیر] موجودگی میں عمل ہو ہی نہیں سکتا، حکم ہے: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ''ہر ایسے مال کے لیے جسے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں، ان کو ان کا حصہ دو''۔

[ماہنامہ طلوع اسلام: جولائی ۳۹ء، ص ۵۹ تا ۵۷]

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ [۲/۲۶۷] ''اپنی کمائی میں سے عمدہ چیز خرچ کرو'' میں ما کسبتم سے مطلب ہی یہ ہے کہ جو کچھ تم کھاتے ہو، وہ تمہاری ملکیت ہے'' [طلوع اسلام، جولائی ۳۹، ص ۶۰]

اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں: پرویز صاحب

لیکن اشراکیت کے مطالعے کے بعد قرآن میں ذاتی ملکیت کی تمام نئی مارکسی تفاسیر پرویز صاحب نے پیش کیں ''نظام ربوبیت'' کے نام سے کتاب لکھی اور ذاتی ملکیت کو قرآن سے غلط ثابت کر دیا۔ اس کے باوجود دعویٰ ہے کہ ان کے افکار میں کبھی تضاد نہیں رہا۔ جعفر شاہ پھلواریؒ کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ ''میں اس وقت ذاتی ملکیت کے متعلق قرآن کی اس تعلیم کو ہنوز نہیں سمجھ سکا تھا جواب میرے سامنے آئی ہے۔ اب تو میں ذاتی ملکیت کا قائل ہی نہیں رہا۔ [ص ۱۹۰، جریدہ جلد نمبر ۲۹، جامعہ کراچی] یعنی قرآن پرویز صاحب کے فہم کا منتظر ہے کہ وہ کیا فرماتے ہیں، امت پندرہ سو برس تک قرآن میں ملکیت کی آیات کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکی۔

پرویز صاحب: پہلے زکوۃ کے قائل تھے

''اشتراکیت کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی کا سرمایہ جائیداد، کمائی، ورثہ سب کچھ حکومت لے لے، تو یہ انفاق کی وہ حد ہے جس سے بڑھ کر قربانی اور ایثار کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی، لیکن اسلامی انفاق، جو [تقویٰ پر مبنی ہے] اور اس قسم کے جبر میں بڑا فرق ہے، اسلام نے بھی ایک ٹیکس [زکوٰۃ] مقرر کیا ہے جو بہر حال وصول کیا جاتا ہے:

''ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے کہ اس سے یہ ظاہر و باطن میں پاک ہو جائیں گے اور پھر ان کے لیے دعا کیجیے''۔ [۹/۱۰۳] [طلوع اسلام، جولائی ۳۹ء ص ۶۱]

قل العفو کے معنی: پرویز صاحب کا قدیم نقطۂ نظر

''لیکن ساتھ ہی، اس نے خیرات کا حکم بھی دیا ہے جس میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں: ''آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جتنا آسان ہو''۔ [۲/۲۱۹] [جولائی ۳۹ء: ص ۶۱] بعد میں

پرویز صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہے، ریاست وہ جبراً وصول کر لے گی لوگوں کو صرف بستر برتن گھر وغیرہ استعمال کے لیے دے گی یہی لوگوں کی ملکیت ہوں گے۔

رزق میں ایک دوسرے پر فضیلت جائز تھی: پرویز صاحب

قرآن کی رو سے ایک دوسرے پر رزق میں فضیلت جائز ہے **وَاللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق** [۱۶/۷۱] ''اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار رزق فضیلت دی ہے'' اور وہ غلام اور آزاد میں یہی فرق بتاتا ہے کہ آزاد اپنی محنت کے ماحصل کا مالک ہوتا ہے، غلام کو اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا **ضرب اللہ مثلا عبدا مملوکا لایقدر علی شیئی و من رزقنہ منا رزقا حسنا فھو ینفق منہ سرا و جھرا** ''اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے، ایک غلام ہے، دوسرے کی ملک، وہ خود کسی بات کی قدر نہیں رکھتا اور ایک دوسرا آدمی ہے جسے ہم نے اپنے فضل سے نہایت عمدہ روزی دے رکھی ہے۔ وہ ظاہر پوشیدہ جس طرح چاہتا ہے، اسے خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟'' رزق میں مختلف مدارج اس لیے ضروری ہیں کہ دنیا کا کاروبار چل ہی اس انداز سے سکتا ہے، تقسیم عمل کے لیے اختلافِ مدارج لاینفک ہے **نحت قسمنا بینھم معشتھم فی الحیاۃ الدنیا و رفعنا بعضم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا** ''دنیاوی زندگی میں ان کی روزی ہم ہی تقسیم کرتے ہیں اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دے رکھی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔'' [معارف القرآن، جلد اول، ص ۱۲۱]

پرویز صاحب: عہد صحابہ میں معاشی مساوات کے قائل نہ تھے

''مالی تفوق کے اعتبار سے خود دورِ صحابہ میں بھی مختلف طبقات موجود تھے۔ حضرت زبیر بن العوامؓ کے کاروبار میں ایک ہزار مزدور روزانہ کام کرتے تھے۔ حضرت طلحہؓ کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک ہزار دینار تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی تجارتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ان کا قافلہ مدینہ میں آیا تو اس میں سات سو اونٹوں پر صرف اشیاء خوردنی لدی رہی تھیں، لیکن مسلمانوں میں ان ہستیوں کا نام اگر آج تک صلوٰۃ وسلام کے ساتھ لیا جاتا ہے تو اس کی وجہ ان کی دولت وثروت نہیں، بلکہ ان کا وہ ایمان، تقویٰ، اعمالِ صالحہ، ایثار وقربانی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے انھوں نے بطورِ نمونہ کے یادگار چھوڑا ہے۔ انہی متمول صحابہ کے ساتھ ساتھ اصحابِ صفہ جیسے مفلوک الحال حضرات کا نام بھی آج تک مسلمانوں کے لیے باعثِ افزائش ایمان وعمل ہے''۔ [جولائی ۳۹ء: ص ۶۹]

پرویز صاحب: صحابہ کے معاشی تفاوت کی کیفیت

''یہ معرکہ، اخلاص ومنافقت کی امتحان گاہ تھا چنانچہ ایک طرف صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا، لے کر حاضر ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ نے نو سو اونٹ، ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے چالیس ہزار درہم دیئے۔ حضرت عمرؓ کئی ہزار روپے کا نقد وجنس لے کر

حاضر ہوئے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے گھر میں اللہ اور رسولؐ کی محبت کے سوا کچھ بھی چھوڑ کر نہ آئے۔ حضرت ابوعقیل انصاریؓ نے دوسیر چھوہارے لا کر حاضر کر دیئے اور عرض کیا کہ رات بھر کسی کے کھیت پر مزدوری کر کے چار سیر چھوہارے حاصل کیے تھے، دوسیر بال بچوں کو دے آیا ہوں اور دوسیر خدمتِ اقدس میں حاضر ہیں''۔[معارف القرآن: جلد چہارم،ص۵۸۰]

قل العفو کا مفہوم: پرویز صاحب کا جدید اشتراکی نقطۂ نظر

''صحیح نظامِ زندگی یہ ہے کہ تم اکتسابِ رزق کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرو، اور اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لو اور باقی سب دوسروں کی پرورش کے لیے عام کر دو''۔

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو [۲/۲۱۹]''تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لیے''کھلا رکھیں''؟ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے، سب کا سب''۔ [اسلام کیا ہے؟ص۱۴۵]

اشتراکیت سے متاثر ہوتے ہی پرویز صاحب نے انفاق کا معنی''خرچ کرنا''نہیں بلکہ''کھلا رکھنا''بیان کیا اسی طرح''العفو''کا مفہوم بھی ذہنی تغیر کے ساتھ تبدیل ہو گیا۔ پرویز صاحب کے سابقہ دور میں مفہوم آیت کیا تھا؟ یہ بھی دیکھ لیجیے:

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو [۲/۲۱۹]''آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جتنا آسان ہو''۔[جولائی ۳۹:ص۶۱]

قل العفو کے جدید مفہوم کی اساس پر نظام ربوبیت، جو اشتراکیت ہی کا''قرآنی ایڈیشن''ہے کی عمارت استوار کی گئی۔اب''زائد از ضرورت''مال و دولت کی موجودگی بھی خلافِ قرآن اور زمین کی شخصی ملکیت بھی، نہ صرف خلافِ قرآن بلکہ کفر و شرک قرار پا گئی: رزق میں فضیلت کی تمام آیتیں منسوخ ہو گئیں، معاشی مساوات دینی تقاضہ بن گئی، زائد ضرورت مال ریاست کی ملکیت بنا اور ضرورت کے تعین کا اختیار ریاست کو دے دیا گیا، ایسا جبر اسلامی تاریخ میں کبھی نظر نہیں آیا۔

زمین: ذاتی ملکیت کفر و شرک

''قرآنِ کریم کی رو سے زمین[وسائل پیداوار]پر ذاتی ملکیت کا تصور ہی باطل اور شرک کے مترادف ہے''[مئی ۶۸:ص۱۷]

اب وہ آیات جو تفاضل فی الرزق پر دلالت کرتی ہیں، ان کا مفہوم بھی بدل گیا۔مثلاً آیت [۱۶/۷۱] کے ابتدائی جملہ کا ترجمہ اب یہ قرار پایا:

واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق [۱۶/۷۱]''مختلف افراد میں، اکتسابی استعداد کا تفاوت، خدا کی طرف سے ہے[تمہارا اپنا پیدا کردہ نہیں]''۔[نظامِ ربوبیت:ص۱۳۲]

جبکہ سابقہ دور میں ان الفاظ کا ترجمہ یہ تھا''اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار روزی

کے برتری دی ہے''۔[معارف القرآن: جلد اول،ص ۱۲۱]

رہا صحابہ کے درمیان، معاشی تفاوت اور تفاضل، تو اسے اب یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ جب قرآن، قل العفو کے حکم کی بنا پر کسی کے پاس فاضلہ دولت رہنے ہی نہیں دیتا اور اپنی ''زائد از ضرورت دولت'' سے ہر ایک کو دست کش ہونا پڑتا ہے، تو پھر وہ تمام روایاتِ تاریخ جو صحابہ کے معاشی تفاضل و برتری کا ذکر کرتی ہیں، قرآن سے متصادم ہو جاتی ہیں لہٰذا

''جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہدِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آتے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہیے''۔[طلوع اسلام، جولائی ۵۹ء،ص ۱۲]

زمین اور قرآن کریم:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاتِیْ الاَرضَ ننقصها من اطرافها [۱۳/۴۱] ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم ان[ظالموں] پر ہر طرف سے زمین تنگ کرتے چلے آ رہے ہیں''۔ اور **اَفَلا یرون انا ناتِی الارضَ نَنقصها اطرفها افهم الغالبون**[۲۱/۴۴]''کیا یہ کفار نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو تمام سمتوں سے ان پر تنگ کرتے چلے آ رہے ہیں کیا وہ غالب ہوں گے؟''

ان آیات کا پرویزی مفہوم:

''کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو جاگیرداروں کی ملکیت سے کم کرتے جاتے ہیں......''[۱۳/۴۱][نظامِ ربوبیت: ص ۴۰۰]

''سورۃ الانبیاء میں کہا ہے کہ انہیں اور ان کے آباء واجداد کو زمین متاعِ حیات حاصل کرنے کے لیے ملی تھی۔ اس پر زمانہ گزر گیا تو انھوں نے اس پر قبضہ مخالفانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ اسے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔''[شاہکار رسالت: ص ۳۴۵]

مندرجہ بالا آیات کا قدیم پرویزی مفہوم جو درست تھا:

اَوَلَم یَرَوا اَنَّا نَاْتِیْ الارْضَ نَنَقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِهٖ وَهُوَ سَرِیْعِ الْحِسَابِ[۱۳/۴۱]

''پھر کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم اس سرزمین کا قصد کر رہے ہیں؟ اسے اطراف سے گھٹا کر[ظالموں پر] اس کی وسعت تنگ کر رہے ہیں، اور جو فیصلہ اللہ کرتا ہے کوئی نہیں جو اسے ٹال سکے، وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے''۔[معارف القرآن: جلد اول،ص ۴۷۴]

بَلْ مَتَّعْنَا هٰؤلآءِ وَاٰبَاءَ هُمْ حَتّٰی طَالَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ اَفَلاَ یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِیْ الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَا فِهَا اَفَهُمُ الْغَالِبُوْنَ [۲۱/۴۴]

''اصل یہ ہے کہ ہم نے انھیں اور ان کے باپ دادوں کو[فوائد زندگی سے] بہرہ ور ہونے کے موقعے دیے۔ یہاں تک کہ[خوش حالیوں کی سرشاری میں]ان کی بڑی بڑی عمریں گزر گئیں[اور اب غفلت ان کی رگ رگ میں رچ گئی ہے]مگر کیا یہ لوگ نہیں دیکھ رہے کہ ہم زمین کو چاروں طرف سے ان پر تنگ کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں؟ پھر کیا وہ[اس مقابلہ میں]غالب ہو رہے ہیں؟''[معارف القرآن: جلد سوم، ص۶۶۳]

پرویز صاحب کے افکار میں تضادات کا مختصر جائزہ جدیدیت کے اثرات کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔ اب جدیدیت کے تحت ان کے نئے افکار ملاحظہ کیجیے جن کی بنیاد قرآن وسنت میں موجود نہیں۔

ترکے میں زمین اور مال نہیں ہوسکتا:

قرآنی نظامِ ربوبیت میں چونکہ ملکیت اشیائے صرف تک ہی محدود ہوتی ہے لہٰذا ان احکام کا اطلاق صرف انہی اشیاء پر ہوگا یعنی انسان کا لباس، بستر، فرنیچر وغیرہ اور یہی اشیاء بطور ترکہ آگے منتقل ہوسکتی ہیں اگرچہ اس کی اولاد اس ترکہ کی بھی محتاج نہ ہوگی کیونکہ اس کی تمام ضروریات تو معاشرہ پوری کر رہا ہوگا''۔[قرآنی نظام ربوبیت، ص۲۲۹]

پرویز صاحب وراثت کے قائل تھے:

''اسی مسئلہ وراثت کو لیجیے، قرآن نے وصیت کا حکم دے کر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دے کر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجب عجب قسم کی الجھنیں پیدا ہوگئیں پھر قانونِ وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآن مجید کو کچھ کا کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں جائز وارث اپنے آباء واجداد کی جائیدادوں سے محروم ہوگئے۔[قرآنی فیصلے، ص۱۲۲]

پرویز صاحب ملکیت کے قائل تھے:

''قرآن میں انتقال اموال کی جتنی شکلیں ہیں ان میں سے کہیں بھی اس قسم کے وقف کا جواز نہیں نکلتا، مثلاً خرید وفروخت، بخشش، وصیت، وراثت، قرض، خیرات وغیرہ میں کوئی شکل ایسی نہیں جس میں منتقل کردہ مال دوسرے کی ملکیت میں نہ چلا جائے اور اس طرح اس پر پہلے مالک کا قبضہ بدستور رہے''۔[قرآنی فیصلے، ۲۱۳]

احکام ملکیت ووراثت کی پرویزی تشریح:

''اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن میں وراثت کے احکام کس لیے دیئے گئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے۔ اس لیے وہ جہاں اس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے۔ عبوری دور کے لیے ساتھ کے ساتھ رہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت، قرضہ، لین

دین، صدقات وخیرات وغیرہ کے متعلق احکام اسی دور سے متعلق ہیں جس میں سے گزر کر معاشرہ انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔ جس طرح کوئی ایک معاشرہ جو قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے، بتدریج آخری نقطہ تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح تمام نوعِ انسانی بھی رفتہ رفتہ اس انتہائی نقطہ کی طرف جا رہی ہے جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے کے تقاضے اب کچھ ایسے شدید ہو چکے ہیں کہ ان کا حل ان قوانین کے بغیر ممکن نہیں جو قرآن نے انتہائی منزل کے لیے تجویز کیے تھے اور جس کا نمونہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات میں دکھا دیا تھا۔ تمام نوع انسانی بھی رفتہ رفتہ اس انتہائی نقطہ کی طرف جا رہی ہے جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ کے تقاضے اب کچھ ایسے شدید ہو چکے ہیں کہ ان کا حل ان قوانین کے بغیر ممکن نہیں جو قرآن نے انتہائی منزل کے لیے تجویز کیے تھے اور جس کا نمونہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات میں دکھا دیا تھا۔ تمام نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے مسلسل محنت اور کاوش لیکن فاضلہ دولت اور ذاتی ملکیت کی نفی۔ یہی ہے وہ نظام ربوبیت جسے قرآن انسانی معاشرہ کی آخری شکل قرار دیتا ہے۔'' [قرآنی نظامِ ربوبیت، ص ۲۵]

نظام ربوبیت: رسول اللہ نے شاید یہ نظام متشکل فرمایا ہو:

''میں نے جو گزشتہ صفحات میں لکھا ہے (اور جو کچھ بعد میں آئے گا) اس میں آپ نے ایک چیز کو نمایاں طور پر محسوس کیا ہوگا اور وہ یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی سند میں صرف قرآن کی آیات پیش کی ہیں۔ تاریخ اور روایات سے کچھ نہیں لکھا حتیٰ کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نبی اکرمؐ نے جس نظام ربوبیت کو متشکل فرمایا اس کے خدوخال کیا تھے؟ اور وہ کب تک علیٰ حالہ قائم رہا..... ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا ہے وہ قرآن کی رو سے صحیح ہے تو اس کے بعد ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل فرمائی ہوگی''۔ [ن۔ر۔ص ۲۲۳، ۲۲۴]

رسول اللہ نے نظامِ ربوبیت قائم کر لیا تھا:

''آج دنیا حیران ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ کی قلیل جماعت نے اتنے مختصر سے عرصہ میں ایسی محیر العقول ترقی کس طرح کر لی تھی۔ دنیا حیران ہے اور اس کے لیے تحقیقاتی ادارے قائم کرتی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں کہ رسول اللہ نے وہ معاشرہ متشکل کر لیا تھا جو قرآنی نظامِ ربوبیت کا حامل تھا۔ یہ تمام محیر العقول ترقیاں اسی کے ثمرات تھیں''۔ [ن۔ر، ص ۱۸۰]

دورِ نبوی میں نظام ربوبیت قائم نہیں ہو سکتا تھا:

''لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جس زمانہ (چھٹی صدی عیسوی) میں قرآن نازل ہوا ہے، ذہن انسانی اپنی پختگی تک نہیں پہنچ چکا تھا۔ اس نے فقط اپنے عہد طفولیت کو چھوا تھا۔ اب اسے رفتہ رفتہ پختگی تک پہنچنا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فقید المثال تعلیم اور سیرت سے قرآنی

اصولوں کو معاشرہ میں نافذ العمل کر کے دکھا دیا تھا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصول ناممکن نہیں۔لیکن اس زمانے کی دنیا ہنوز ذہنی طور پر اس سطح پر نہیں آ چکی تھی کہ وہ ان اصولوں کو یا ان کی بنیادوں پر قائم کردہ معاشرہ کو شعوری طور پر اپنا سکے۔ یہ چیزیں ابھی ان کے شعور میں سما ہی نہیں سکتی تھیں۔اگر مسلمان اسے اسی ''ایمان بالغیب'' کے انداز سے جس سے یہ معاشرہ قائم ہوا تھا۔آگے چلاتے رہتے تو یہ آگے بڑھتا رہتا۔ لیکن انھوں نے اس طریق کو چھوڑ دیا اور شعوری طور پر دنیا ہنوز اس قابل نہ تھی کہ اسے اختیار کر سکتی لہٰذا یہ نظام ختم ہو گیا۔[ن۔ر،ص۲۳۴] پرویز صاحب کیا فرما رہے ہیں؟ آپ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے یہ نظام قائم تو فرمایا تھا مگر صحابہ کو اس کی سمجھ نہ آ سکی پھر اس میں قصور صحابہ کا بھی نہیں کیونکہ اس دور میں انسان کی ذہنی سطح ربوبیت کا نظام سمجھنے کے قابل ہی نہ تھی۔ ہاں اگر صحابہ جس طرح اللہ، کتابوں، رسولوں، فرشتوں اور یوم آخرت پر ایمان بالغیب لائے تھے اسی طرح اس فلسفہ پر بھی ایمان بالغیب لے آتے تو یہ نظام آگے چلتا رہتا۔لیکن چونکہ صحابہ اس فلسفہ پر ایمان بالغیب نہ لائے اور نہ ہی ان کی ذہنی سطح اس قابل تھی کہ وہ اس فلسفہ کو سمجھ سکتے لہٰذا انھوں نے اس نظام کو چھوڑ دیا اور اس طرح یہ نظام رسولؐ اللہ کی رحلت کے فوراً بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔

نظام ربوبیت: حضورؐ کے بعد پہلی کوشش:

''جہاں تک میرا مطالعہ رہنمائی کرتا ہے قرن اول کے بعد (جس میں یہ نظام اس زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عملی شکل میں قائم ہوا تھا) اسلام کی تاریخ میں میری یہ پہلی کوشش ہے جس میں اس نظام کو سامنے لایا گیا ہے۔[ن۔ر، مقدمہ،ص۲۲] افسوس کہ چودہ سو سال تک امت اس نظام سے مکمل محروم رہی حتیٰ کہ کتابوں میں بھی اس نظام کا تذکرہ نہ ملا۔ پہلی مرتبہ یہ نظام عہد رسالت کے بعد پرویز صاحب پر منکشف ہوا۔ وہی اس نظام کے موجد ہیں کیونکہ انسانی شعور اب ارتقاء کر چکا ہے اور اس نظام کی ضرورت آج کے دور میں محسوس ہو گئی ہے۔

قرآنی آیات کی تحریف سے تاویلات:

''ہر شخص چاہتا تھا کہ جو کچھ اسے مردوں سے ہاتھ آئے سب کچھ سمیٹ کر رکھا جائے (۹۸۔۱۹) اور ادھر ادھر کا مال اکٹھا ہو کر اس کے گھر پہنچ جائے (۲۶۔۸۹) اور ادھر ادھر کا مال اکٹھا ہو کر اس کے گھر پہنچ جائے [۲۶۔۸۹] اس معاشرہ کا انجام اگر جہنم کی تباہیاں نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ آگ کہیں باہر سے نہیں آئی۔ وہی دولت جو انھوں نے جمع کر رکھی تھی، بند رہنے سے اس قدر گرم ہو گئی ہے کہ اس سے ان کے جسموں کو داغا جا رہا ہے۔[۹:۳۵] جو انھوں نے بڑے بڑے لمبے چوڑے سہاروں اور بھروسوں کے ستونوں میں بند کر رکھی تھی۔اب وہی آگ ان کے دلوں پر چڑھ رہی ہے۔[۱۰۴:۶ تا ۹] قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت انسانیت کی سطح تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ان کی زندگی حیوانی سطح پر تھی جو کھاتے پیتے اور مر جاتے ہیں اور زندگی کا نتیجہ یہ جہنم ہے۔[۴۷:۱۲] [ن۔ر،ص۹۹] اس چند سطور کے اقتباس پر چار

مختلف سورتوں الفجر، التوبہ، الہمزہ اور محمد کی مختلف آیات کو جوڑ کر مال جمع کرنے کی مذمت پیش کرنے کے علاوہ درج ذیل انکشافات بھی فرمائے گئے:

۱۔ اگر کہیں دولت کو جمع کر کے رکھا جائے تو وہ دولت اس قدر گرم ہو جاتی ہے کہ اس سے جسموں کو داغا جا سکتا ہے۔

۲۔ اور اگر یہ دولت بڑے لمبے چوڑے سہاروں اور بھروسوں کے ستونوں (جو آج کل بینک بھی ہو سکتے ہیں، مؤلف) میں رکھی جائے تو وہ آگ جو اس دولت میں پیدا ہوتی ہے اس سے جسم تو خیر نہیں داغے جاتے البتہ وہ آگ دلوں پر چڑھنا شروع کر دیتی ہے۔

آج کل بھی بہت سے لوگ دولت گھروں میں بھی دفن کرتے ہیں اور بینکوں میں بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی یہ جمع شدہ دولت گرم ہوتی ہے یا اس کی گرمی سے کوئی شخص داغا گیا ہے؟ یا یہ دولت کی آگ کسی کے دل پر چڑھا کرتی ہے؟ یہ ہے پرویز صاحب کے حیات بعد الممات میں جہنم کے عذاب سے انکار کا نمونہ۔ ایسے عذاب کو وہ اسی دنیا میں اور محض الفاظ کی بازی گری کے رنگ میں پیش فرما رہے ہیں۔

قرآنی آیات کی من پسند تشریحات:

''جس انقلابِ عظیم کے متعلق تمہیں کہا جا رہا ہے وہ آ کر رہے گا [۲۲:۲۰۱] اس وقت یہ تمام سرکش اور متمرد ارباب اقتدار جو اس وقت اس نظام کی مخالفت میں اس قدر زوروں پر ہیں، خاسر و ناکام، بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگیں گے [۱۴:۴۲ تا ۵۲] ان سے کہا جائے گا کہ اب کہاں بھاگ رہے ہو؟ [۲۱:۲۳] اب کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ [۷۵:۱۱] اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے تمہارا اعمال نامہ جو اس وقت اس انقلاب کے رنگ میں بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آیا ہے۔ [۴۵:۲۷] اس وقت ان کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے کٹے ہوئے کھیت یا بجھے ہوئے کوئلے۔ [۲۱:۱۴] پھر ان پر نہ آسمان روئے گا نہ زمین، صف ماتم بچھ جائے گی۔ [۴۴:۲۹] اور نہ ہی ہم متاسف ہوں گے۔ [۹۱:۱۵] لہٰذا ان سے کہو کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اس پر ہنسو نہیں بلکہ خون کے آنسو روؤ۔ [۵۲:۶۰] کہ یہ مقام رونے ہی کا ہے۔''

[ن۔ر، ص ۲۴۹۔۲۵۰]

مندرجہ بالا چند سطور کے اقتباس میں آٹھ مختلف سورتوں کی آیات کو بھونڈے طریقے سے جوڑ کر قیامت کے مناظر سے ''نظام ربوبیت کے یوم انقلاب'' کو برآمد کیا گیا ہے۔ یہ محض پرویز صاحب کا کمال ہے۔

''یہ فطرت کا اٹل فیصلہ ہے جسے واقع ہو کر رہنا ہے جو بڑی بڑی طاقتیں نظام ربوبیت کی راہ میں حائل ہوں گی، انھیں اس طرح راستے سے ہٹا دیا جائے گا جس طرح تیز و تند ہوا بڑے بڑے تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہے۔ **ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفا** [۲۰:۱۰۵] اور اس کے بعد میدان صاف ہو جاتا ہے۔ **فیذرھا قاعاً صفصفاً** [۲۰:۱۰۶] جس میں نہ کوئی ٹیڑھ

پن باقی رہتا ہے نہ اونچ نیچ۔ لاترىٰ فيها عوجا ولا امتا [۲۰۔۱۰۷] ان سے اس طرح میدان صاف کر دینے کے بعد انسانیت کا وہ گروہ عظیم جو آج تک اسے بری طرح کچلا جا رہا ہے [(یعنی مزدور طبقہ۔مرتب] ابھر کر اوپر آ جائے گا۔ وترى الارض بارزة [۱۸:۴۷] [ن۔ر،ص ۲۷۸] اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ جبال کے معنی نظام ربوبیت کی مخالف قوتیں ہیں جو بڑی بڑی ہی ہوتی ہیں چھوٹی نہیں ہوسکتیں۔

۲۔ ارض کے معنی ''بری طرح سے کچلا ہوا طبقہ'' ہے۔

۳۔ قرآن میں جو قیامت کے مناظر پیش کیے گئے ہیں یہ فی الحقیقت نظام ربوبیت کے انقلاب کے مناظر ہیں۔ کیونکہ الساعۃ کا یہی عملی مفہوم ہے۔

۴۔ بارزۃ کے معنی کھلے میدان میں سامنے آنا نہیں بلکہ ابھر کر اوپر جانا ہے۔

قرآنی آیات سے دل پسند تشریحات کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔

نماز تبدیل کی جاسکتی ہے: پرویز صاحب

لہٰذا جو اعمال ملت میں تواتر سے چلے آرہے ہیں انھیں علی حالہ رہنے دیا جائے گا۔ البتہ جن جزئیات میں مختلف فرقوں میں اختلاف ہے قرآنی معاشرہ ان کو بتدریج ختم کر دے گا۔ تاہم اگر یہ قرآنی حکومت ان مسلمہ جزئیات (یعنی نمازوں کی تعداد رکعات کی تعداد، اوقات نماز اور ترکیب نماز) میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہوگی۔ [قرآنی فیصلے، صفحہ:۱۲ تا ۱۴، ملخصاً]

پرویز صاحب حنفی طریقے سے نماز ادا کرتے ہیں:

''میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح جمہور مسلمان (فقہ حنفی کے مطابق) نماز پڑھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اگر کہیں فقہ حنفی کے علاوہ دیگر طریق پر بھی نماز ہو رہی ہو تو ان کے ساتھ شامل ہو جانے میں بھی توقف نہیں کرتا۔ یہاں آپ کے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ میں ایک طرف تو موجودہ نماز کو ایک بے روح رسم پرستش قرار دیتا ہوں اور دوسری طرف اس رسم کا خود بھی پابند ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک نماز بے روح اور بے نتیجہ ہونے کے باوجود دین کے اجزاء ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا قومی شعار سا بن گئی ہے۔ چونکہ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں اور اپنے آپ کو نہ ان سے الگ سمجھتا ہوں نہ برتر۔ لہٰذا میں ان سے الگ ہٹ کر کوئی ''نیا مذہب'' ایجاد نہیں کرنا چاہتا میں اسی درماندہ کاررواں کا ہم سفر ہوں''۔ [قرآنی فیصلے، ص۳۲] واضح رہے کہ پرویز صاحب حنفی فقہ کو غلط سمجھتے ہیں اور اس مکتب کو فرقہ قرار دیتے ہیں اور اس کی دلیل قرآن سے نہیں دیتے اور اس فرقے کے مطابق عمل بھی فرماتے ہیں اور فرقہ بندی کے خلاف بھی ہیں انھیں قرآن وسنت سے صحیح اور اصلی نماز نہیں مل سکی مجبوراً حنفی طریقہ قبول کرلیا اس کی علمی دلیل بھی نہیں دی کہ شرح صدر کیسے حاصل ہوا؟ اس مسئلے کا سادہ حل یہ تھا کہ وہ جمہور کے مسلک

کوصراط مستقیم سمجھ لیتے۔

بزم طلوع اسلام: نماز کا احترام

''دور کہیں مغرب کی نماز ہوا کی۔لیکن ہال میں سگریٹوں کا دھواں اور لاؤڈ اسپیکر کی گونج اور محمد اسلام صاحب [نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی] کی گھن گرج قرآنی فکر کے راستے ہموار کرتی رہی۔ اس کے بعد حیات النبی صاحب نے کہ وہ بھی ایک پرانے رفیق بزم کے ہیں تقریر دل پذیر کی اور لوگوں کو قرآنی دعوت کی طرف بلایا۔جلسہ جاری رہا کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا تھا کہ ایک حضرت، نام جن کا محمد شفیع تھا، مائک کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ''صاحبو! میرے ساتھ دو تین آدمی اور بھی آئے ہیں میں انھیں قرآنی فکر سے روشناس کرنے کے لیے لایا تھا۔لیکن ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ جناب پرویز کے ماننے والے نماز نہیں پڑھتے اب تو ہمیں بھرے جلسے میں اس بات کا ثبوت مل گیا ہے۔ بتایے اب میں ان دوستوں کو کیا جواب دوں؟اس پر تو اسلام صاحب بہت چکرائے''۔

انھوں نے اپنے اسلام کو بچانے کے لیے سات بجے یعنی نماز مغرب کے ٹھیک سوا گھنٹے بعد نماز کا وقفہ یوں کہہ کر کیا کہ:

''ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ایسا ہوا اب آپ حضرات نماز پڑھ لیں۔خواہ قضا ہی سہی'' جلسے کی کارروائی دس منٹ کے لیے ملتوی ہوئی، اسی اللہ کے بندے محمد شفیع نے نماز باجماعت کا بندوبست کیا اور کل پانچ آدمیوں نے کہ ان میں سے ایک بھی بزم طلوع اسلام کا نمائندہ نہیں تھا نماز پڑھی، بزم طلوع اسلام کے اراکین قرآنی گتھیاں سلجھاتے رہے اور محمد شفیع نماز پڑھاتا رہا۔ میں نے سوچا کہ صاحبو! کہ یہ قرآنی فکر بھی خوب ہے اگر صحابہ اس زمانے میں ہوتے تو قرآن کی پیروی ان کے لیے کتنی آسان ہوتی۔نہ انھیں راتوں کو قیام کرنا پڑتا اور نہ نماز پنجگانہ کے جھنجھٹ میں پڑنا پڑتا۔بس نظام صلوٰۃ برپا کرنے کے لیے مصروف جہاد رہا کرتے۔ یہ مسلمانی بھی کیسی خوب اور عہد جدید کے مطابق ہے کہ اسلام پر تین حرف بھیجنے کے باوجود بھی مسلم ہی رہے۔ یہ قرآنی فکر بھی خوب ہے کہ صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظام بے چاروں کے ذہن اس تک رسائی حاصل نہ کرسکے۔ یار لوگوں نے بھی خوب خوب نفس کے بت تراشے ہیں اور انھیں اسلام کے نام پر پیش کرنے پر مصر ہیں۔اگر نہ مانو تو گردن زدنی، مان لو تو اسلام کا خسارہ،اس کے بعد کچھ کام و دہن کی لذت کا سامان ہوا اور پھر ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے نام سے ایک ڈرامہ پیش کیا گیا۔لیکن ہم ڈرامہ دیکھے بغیر ہی واپس چلے آئے''۔[اخبار جہاں،کراچی،۸؍جنوری ۱۹۶۹ء]

حکومت نہ ہو تو زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے: پرویز صاحب کا فتویٰ

''زکوٰۃ کے لیے قرآن میں حکومت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرے۔ **خذ من اموالهم صدقة** [۹۔۱۰۳]اس لیے زکوٰۃ اس ٹیکس کے سوائے اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی اس لیے کہ شرح زکوٰۃ کا انحصار ضروریات

ملی پر ہے۔حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں وہ سب کچھ وصول کرسکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو۔ **یسئلونک ماذا ینفقون قل العفوا** لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہوتو زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی۔'' [قرآنی فیصلے،ص ۳۵]

اس مبحث سے عجیب استدلال اخذ کیا گیا ہے مثلاً زکوٰۃ اور حکومت لازم وملزم ہیں جہاں اسلامی حکومت نہ ہوتو وہاں زکوٰۃ بھی نہیں رہتی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ ہی عاملین زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔

اس مبحث سے عجیب استدلال اخذ کیا گیا ہے مثلاً زکوٰۃ کی شرح قرآن میں متعین نہیں، لہٰذا ایک اسلامی حکومت جو کچھ بھی ملی ضروریات کے لیے لوگوں سے وصول کرتی ہے وہ زکوٰۃ ہی ہوگی بالفاظ دیگر زکوٰۃ کی شرح متعین کرنا ہر دور کی اسلامی حکومت کا اپنا کام ہے۔

زکوٰۃ اور ٹیکس میں کوئی فرق نہیں۔اگر حکومت غیر اسلامی ہوتو جو کچھ لوگوں سے وصول کرتی ہے اسے ٹیکس کہہ دیتے ہیں اور اگر حکومت اسلامی ہوتو اسے زکوٰۃ کہتے ہیں صرف نام کا فرق ہے بات ایک ہی ہے۔

اگر حکومت اسلامی ہوتو عندالضرورت لوگوں سے سب کچھ وصول کرسکتی ہے جو ان کی ضرورت سے زائد ہو۔

زکوٰۃ: پرویز صاحب کا موقف اور تاریخ کا فیصلہ

مکی دور میں اسلامی حکومت کا نام ونشان تک نہ تھا لیکن مکی صورتوں میں بھی مسلمانوں کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔مثلاً سورہ معارج اور ذاریات دونوں میں مسلمانوں کو اپنے اموال سے سائل اور محروم کا ''حق'' ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ جیسے اہم دینی فریضہ کو حکومت کی شرط سے مشروط نہیں کیا۔کئی انبیاء اور ان کے امتی حکومت قائم کر ہی نہ سکے۔لیکن زکوٰۃ ان سے ساقط نہ ہوئی۔ قرآن میں انفاق فی سبیل اللہ کے احکام دو طرح کے ہیں:

وفی اموالھم حق للسائل و المحروم [الذٰریات ۱۹/۵۱] اور ان [مسلمانوں] کے اموال میں سائل اور محتاج کا بھی حق ہے۔

اور مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ جتنا زیادہ سے زیادہ ہوسکے اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور اس کی آخری حد یہ ہے کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو انھیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔ [۲۱۹:۲]

اور دوسرے احکام وہ ہیں جن کی حیثیت قانونی ہے یعنی کہ کم ازکم وہ مقدار اموال جس کا خرچ کرنا ہر مسلمان پر فرض اور لازمی قرار دیا گیا ہے۔اس مقدار کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

والذین فی اموالھم حق معلوم O للسائل و المحروم O [المعارج ۷۰/

۲۴۔۲۵] اور ان مسلمانوں کے اموال میں سائل اور محتاج کا طے شدہ حق ہے۔

خذا من اموالھم صدقة [التوبۃ ۹/۱۰۳] ''ان مسلمانوں کے اموال میں سے کچھ حصہ وصول کیجیے''۔

اس آیت میں مِن، تبعیض کے لیے آیا ہے یعنی حکومت کو کچھ حصہ [حق معلوم] ہی لینے کا حق ہے۔ سارا مال لینے کا حق نہیں ہے۔ گویا کوئی مسلمان اگر خود چاہے تو ضرورت سے زائد سارا مال خرچ کرسکتا ہے لیکن حکومت کو قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی کا ضرورت سے زائد سارا مال جبری وصول کرے۔

قرآن میں زکوٰۃ کی شرح کیوں نہیں ہے؟

اب پرویز صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ کا حکم ستر بار آیا ہے۔ اگر زکوٰۃ کی شرح بھی متعین اور ضروری تھی تو قرآن میں اللہ تعالیٰ اتنا اضافہ فرما دیتے کہ زکوٰۃ اڑھائی فی صد یا چالیسواں حصہ ہے تو کیا حرج تھا؟ یہ اعتراض ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ قرآن میں نماز کی ادائیگی کا حکم سات سو بار آیا ہے۔ اگر صلوٰۃ موقتہ دن میں پانچ ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنی سی بات بتا دیتے تو کیا حرج تھا؟ مگر بات صرف اتنی نہیں بلکہ یہ ہے جس طرح نماز کی جزئیات بے شمار ہیں مثلاً نمازوں کی تعداد اور ہر نماز میں رکعات کی تعداد، اذان کی صورت، نماز کے لیے طہارت کے احکام، نماز کی ادائیگی کی ترتیب وغیرہ۔

ٹیکسوں اور زکوٰۃ کا فرق:

ٹیکسوں اور زکوٰۃ میں بنیادی فرق یہ تھا کہ زکوٰۃ کا نصاب اور شرح ہمیشہ غیر متبدل رہی جب کہ جزیہ اور خراج کی شرح میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جزیہ کی شرح ایک دینار فی کس سالانہ تھی اور رقم ہر بوڑھے، بچے، عورت معذور سب سے بحساب مشترکہ وصول کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس میں اصلاح کی، بوڑھے بچوں، عورتوں اور معذوروں سے جزیہ ساقط کر دیا۔ باقی غیر مسلم معاشرہ کے مالی لحاظ سے تین طبقے مقرر کیے جن سے علی الترتیب ۴ دینا، ۲ دینار اور ایک دینار سالانہ کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح قبیلہ بنی تغلب کے عیسائیوں نے مسلمانوں سے یہ درخواست کی کہ ان سے خراج کے بجائے دوگنا عشر لیا جائے تو مسلمانوں نے ان کی یہ تجویز منظور کرلی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں زکوٰۃ کو دین کا رکن سمجھا جاتا تھا اور اس کے احکامات غیر متبدل تھے۔ جب کہ جزیہ اور خراج کی شرح میں تغیر و تبدل کیا جاتا تھا۔

تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کے علاوہ جو کچھ بھی وصول کیا جائے اسے مکس کہا جاتا تھا۔ مکس کے معنی المنجد (عربی۔اردو) نے ''محصول ٹیکس اور چونگی'' لکھے ہیں اور ماکس کے معنی ٹیکس وصول کرنے والا۔ منتہی الارب (عربی، فارسی) نے اس کے معنی ''باج خراج گرفتن'' اور مقائیس اللغۃ (عربی، عربی) میں اس کے معنی ''کلمة تدل علی جبی مال'' اور جبایہ کا لفظ محصول اکٹھا کرنے کے لیے محاورتاً استعمال ہوتا ہے۔ مکس کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں

جب قبیلہ غامدیہ کی عورت کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے اسے ایک پتھر مارا جس کی وجہ سے خون کے چند چھینٹے حضرت خالد کے منہ پر بھی آ پڑے حضرت خالدؓ نے اس عورت کو گالی دی تو حضور اکرمؐ نے حضرت خالد کو مخاطب کر کے فرمایا:

مهلاً يا خالد فوالذى نفسى بيده لقد ثابت توبة لو تابها صاحب مكس لغفر له [مسلم، کتاب الحدود باب حد الزنا] اے خالد یہ کیا بات ہوئی۔ اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر کوئی ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرے تو معاف کر دیا جائے۔

گویا مکس کا جرم کسی صورت میں زنا سے کم نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

لايدخل صاحب مكس فى الجنة ''ٹیکس وصول کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا''۔

اللہ اور رسول = مرکز ملت / امام وقت / اسلامی نظام حکومت
مرکز ملت رسول کے فیصلے منسوخ کر سکتا ہے

''قرآن میں جہاں ''اللہ اور رسول'' کے الفاظ اکٹھے آتے ہیں، وہاں اس سے مراد کیا ہوتی ہے؟.....اس سے مراد ''اسلامی نظامِ حکومت'' ہے جو خدا کے احکام نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔''
[قرآنی فیصلے، ج ا ص ۲۳۷]

پرویز صاحب علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب ''الدرّ المنثور'' اور امام رازیؒ کی تفسیر سے غلط استدلال کرتے ہوئے ان حوالوں کو غلط طریقے سے اپنے غلط عقائد کے حق میں پیش کرتے ہوئے یہ عجیب استدلال کرتے ہیں۔

> ''ان حضرات کے اَقوال سے دو باتیں ظاہر ہوگئیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک ''اللہ اور رسول'' سے مراد امامِ وقت ہے اور دوسرے یہ کہ .....'' [قرآنی فیصلے: ۲/۲۲۴] جب کہ امام رازی اور سیوطی نے کبھی بھی اللہ اور رسول کو امام وقت نہیں قرار دیا۔

يَا يُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اَطِيعُوا اللهَ وَاَطِيعُوا الرَّ سُولَ وَاُولِى الاَ مرِ مِنكُم

''اس آیتِ مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے، اس میں اللہ و رسول سے مراد مرکزِ ملت یعنی نظامِ خداوندی (Central Authority) اور اولوالامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت'' قرآنِ کریم میں مرکز ملت کو اللہ اور رسول کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔''

[معراجِ انسانیت از پرویز: ص ۳۲۲، ۳۲۳]

> ''رسول اللہ کے بعد خلیفۃ الرسول اللہ کی جگہ لے لیتا ہے، اب خدا اور رسول کی

اطاعت سے مراد اسی جدید مرکزِ حکومت کی اطاعت ہوتی ہے۔'' [معراجِ انسانیت:ص ۳۵۷]

''اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکزِ نظامِ اسلامی ہے جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں۔''

[معراجِ انسانیت،ص ۳۱۸]

حکومت کے انتظامی امور کے لیے ایک مرکز ہوگا اور اس مرکز کے ماتحت افسران مجاز قرآن کریم میں اس کے لیے خدا اور رسول کی اصطلاح آتی ہے۔[قرآنی قوانین ص ۶]

مرکز ملت رسول اللہ کے فیصلے منسوخ کرسکتا ہے:

''[اسلامی نظام] سابقہ ادوار کے فیصلوں میں خواہ وہ رسول اللہ کے زمانے میں ہی کیوں نہ صادر ہوئے ہوں، ردوبدل کرسکتا ہے اور بعض فیصلوں کو منسوخ بھی کرسکتا ہے۔''

[شاہکارِ رسالت،ص ۲۸۱]

جہنم کا وجود نہیں: قلبی کیفیت ہے

''جہنم انسان کی قلبی کیفیت کا نام ہے، لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ غیر محسوس، مجرد حقائق کو محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے۔'' [جہانِ فردا:ص ۲۳۵] قرآن کا ارشاد ہے

''مجرم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کے دیدار سے روک دیئے جائیں گے اس کے بعد وہ جہنم میں داخل ہوں گے پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی جہنم ہے جسے تم [دنیا میں] جھٹلایا کرتے تھے۔ [المصطفین ۱۵۔۱۷] جہنم کی تاویل قرآن کریم کا انکار ہے۔

جنت بھی قلبی کیفیت ہے: وجود نہیں رکھتی

''جہنم کی طرح اُخروی جنت بھی کسی مقام کا نام نہیں، کیفیت کا نام ہے۔'' [جہانِ فردا:ص ۲۷۰]

قرآنِ کریم جنت کے متعلق ''مقام'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔قرآن صاف الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اِنَّ المتَّقِینَ فِی مَقَامٍ اَمِینٍ فِی جَنّاتٍ وَّ عُیُونٍ [الدخان:۵۱،۵۲]

''پرہیزگار لوگ اَمن کے مقام جنت اور اس کے چشموں میں ہوں گے۔''

مرنے کے بعد جنت نہیں: اصل جنت دنیا

''جنت کی آسائشیں اور زیبائشیں وہاں کی فراوانیاں اور خوشحالیاں اس دنیا کی زندگی میں حاصل ہوجاتی ہیں، مرنے کے بعد کی جنت کے سلسلہ میں ان کا بیان تمثیلی ہے۔'' [نظامِ ربوبیت:ص ۸۲] یہ خیالات بھی پرویز صاحب کے نہیں ہیں علامہ اقبال کے ہیں۔اقبالؒ نے خطبات میں جنت و دوزخ کو اس طرح بیان کیا ہے اقبالؒ مرنے کے بعد بھی انسانی خودی کے ارتقاء کی نقشہ کشی فرماتے ہیں یعنی قیامت برپا ہونے کے بعد انسان کے عمل کی صلاحیت ختم نہیں ہوگی

جاری وساری رہے گی۔

قرآن کریم واضح الفاظ میں پرویز صاحب کے افکار کی تردید کرتا ہے:

اَعَدَّ اللّٰہ لَھم جَنّٰتٍ تَّجرِی مِن تحتِھا الانھارُ خالِدِینَ فیھَا ذالِک الفُوزُ الکَبِیر

''یعنی ان [کامیاب ہونے والوں] کے لیے جنت کے مقامات اللہ تعالیٰ نے خود تیار کیے ہیں، جن میں نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہ ان کی بڑی کامیابی ہوگی''۔ [التوبہ:۸۹]

''ان مہاجرین وانصار سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگیا، اور وہ اس پر راضی ہوئے اور اس [اللہ] نے ان کے لیے جنت کے مقامات تیار کیے ہیں جن میں نہریں بہتی ہیں، اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے''۔ [التوبہ:۱۰۰]

یوم القیامہ آخرت نہیں انقلاب کا زمانہ ہے:

یوم القیامۃ سے مراد ہوگا وہ انقلابی دور جو قرآن کی رو سے سامنے آیا تھا''۔

[جہانِ فردا:ص۱۳۳]

الساعۃ قیامت نہیں: حق و باطل کی جنگ ہے:

''الســاعۃ'' سے مراد حق و باطل کی وہ آخری جنگ ہوتی ہے جس میں باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ہو جاتی ہیں''۔ [لغات القرآن، ج۲،ص۹۱۸]

آخرت سے مراد مادی فائدہ مادی دنیا میں:

''جو فائدہ پوری نوعِ انسانی کے اندر گردش کرتا ہوا افراد تک پہنچتا ہے، اسے مآلِ کار، آخرالامر یا مستقبل کا فائدہ کہا گیا ہے جس کے لیے قرآن میں آخرت [مستقبل] کی اصطلاح آئی ہے۔'' [سلیم کے نام: ج۱/ص۲۱۳]

آخرت، یوم القیامہ، الساعۃ کی قرآنی اصطلاحات کے پرویزی تراجم محض لفظوں کی بازی گری ہیں۔قرآن، سنت اور اجماع اس موقف کو تسلیم نہیں کرتے۔

سامان آخرت: مستقبل کے لیے مادی وسائل

''سامانِ آخرت سے مقصود ہے وہ متاع جسے [انسان] آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتا ہے''۔ [اسبابِ زوال امت:ص۲۶]

مرنے والے: قبروں میں نہیں روکے جاتے:

یہ تصور صحیح نہیں کہ جتنے لوگ مرتے ہیں وہ مرنے کے بعد قبروں میں روک لیے جاتے ہیں اور پھر ان سب کو ایک دن اکٹھا اٹھایا جائے گا اسے حشر یا قیامت کا دن کہا جاتا ہے۔ [جہان فردا:ص۱۸]

قیامت میں: خدا سے ملاقات ممکن نہیں:

وہ [خدا] ہماری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے اس لیے اس سے جدا ہو کر دنیا میں آنے

اور مرنے کے بعد اس سے پھر جا کر ملنے کا تصور قرآنی نہیں۔[جہاں فردا، ص۳۴]

پرویز صاحب کا مندرجہ بالا موقف البقرہ ۴۶، الجاثیہ ۲۶، الکہف ۴۷، ۴۹ کی آیات سے صریحاً انکار پر مبنی ہے۔ یہ آیات قیامت کے روز اللہ سے ملاقات، میدان حشر میں مجتمع ہونے اور اللہ کے حضور پیشی اور اللہ سے ملاقات کے تصورات کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں۔

ملائکہ وجود نہیں رکھتے: اعمال کے اثرات ہیں

''ملائکہ ہماری اپنی داخلی قوتیں ہیں یعنی ہمارے اعمال کے وہ اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔''[ابلیس و آدم از پرویز: ص۱۶۲] یہ موقف سورہ الاخراب کی آیت ۵۶ کا انکار ہے۔

ملائکہ سے مراد کائنات کی قوتیں:

''ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں جن سے رِزق پیدا ہوتا ہے، انسان کے تابع فرمان ہیں''۔

[''ابلیس و آدم'' از پرویز: ص۵۲]

ملائکہ سے مراد خارجی قوائے فطرت:

''ملائکہ سے مراد مفہوم وہ قوتیں ہیں جو کائنات کی عظیم القدر مشینری کو چلانے کے لیے مامور ہیں۔ یعنی قوائے فطرت، اس لیے قانون خداوندی کی زنجیر کے ساتھ جکڑی ہوئی ہیں کہ ان سے انسان کام لے سکے اسی لیے قصہ آدم میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے آدم کو سجدہ کر دیا۔ مطلب یہ کہ فطرت کی قوتیں انسان کے تابع فرمان بنا دی گئی ہیں''۔[ابلیس و آدم، ص۱۴۴]

ملائکہ سے مراد داخلی قوتیں:

لہٰذا یہ ملائکہ ہماری اپنی داخلی قوتیں ہیں۔ یعنی ہمارے اعمال کے اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں قرآن اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔[ایضاً، ص۶۲]

ملائکہ سے مراد طبعی تغیرات:

''ان مقامات سے ظاہر ہے کہ جو طبعی تغیرات انسان کے جسم میں رونما ہوتے ہیں اور جن کا آخری نتیجہ انسان کی طبعی موت ہوتی ہے۔ انھیں بھی ملائکہ کی قوتوں سے تعبیر کیا گیا ہے''۔[ایضاً، ص۱۵۹]

ملائکہ سے مراد نفسیاتی محرکات:

''ان مقامات [یعنی بدر کے موقعہ پر تین ہزار ملائکہ کا نزول یا ایسی ہی دوسری آیات] پر غور کیجیے۔ ملائکہ کی مدد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس سے جماعت مومنین کے دلوں کو تسکین ملی تھی اور ان کے عزائم پختہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف دشمنوں کے دل خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اور ان کے حوصلے چھوٹ گئے اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں''۔[ایضاً، ص۱۵۵]

ملائکہ: نتائج اعمال مرتب کرنے والی قوتیں:

اگر ایک طرف ملائکہ، ایمان و استقامت کی بناء پر اللہ کی رحمتوں کی نور افشانی کرتے ہیں تو دوسری طرف کفر و سرکشی کے لیے عذاب خداوندی کے حامل بھی ہوتے ہیں ''عذاب خداوندی'' سے مفہوم یہ ہے غلط قوموں کی روش کے تباہ کن نتائج۔ لہٰذا اس باب میں ملائکہ سے مراد وہ قومیں ہیں جو قانون خداوندی کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے لیے سرگرم عمل رہتی ہیں''۔ [ابلیس و آدم، ص ۱۵۸]

فرشتے ملائکہ: زمانے کے تقاضے ہیں

''فرشتے 'ملائکہ' وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیتِ خداوندی کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے زمانے کے تقاضوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔'' ['اقبال اور قرآن' از پرویز: ص ۱۶۵] یہ نقطۂ نظر سورہ فاطر: ۱، زخرف ۱۹، السجدہ ۱۱ کی آیات کا انکار ہیں۔ ملائکہ کے بارے میں جمہور امت کی تعریف و تشریح سے ہٹ کر اپنی عقل کے زور پر پرویز صاحب نے جو موقف اختیار کیا اس کے نتیجے میں انھیں ملائکہ کی کتنی تشریحات پیش کرنی پڑیں یہ آپ کے سامنے ہے۔

پرویز صاحب کے افکار کی نئی اٹھان:

اگر مسلکِ اعتزال باقی رہتا تو:

''اگر مسلکِ اعتزال باقی رہتا تو یہ جمود و تعطل جو آج مسلمانوں میں نظر آ رہا ہے وجود میں نہ آتا اور علم و فکر کی دنیا میں مسلمان آج ایسے مقام پر کھڑے ہوتے جہاں ان کا کوئی مقابل نہ ہوتا'' (طلوع اسلام۔ص: ۳۰، جولائی ۱۹۵۵ء) پرویز صاحب یہ نہیں بتاتے کہ مسلک اعتزال ختم کیوں ہوا۔ اسی سال تک عباسی سلاطین کی سرپرستی مسلک معتزلہ کو حاصل رہی، ظلم و تشدد کی بہیمانہ تاریخ معتزلہ نے تحریر کی لیکن امت نے اجتماعی طور پر انھیں مسترد کر دیا۔ آج ان کا ایک بھی ان کا نام لیوا باقی نہیں رہا۔ پرویز صاحب منکرین حدیث اہل قرآن جدیدیت پسند ہمیشہ اپنے موقف کے حق میں معتزلہ کو پیش کرتے ہیں جب کہ معتزلہ کی تاریخ جبر و تشدد، بہیمیت، غنڈہ گردی اور داروگیر کی تاریخ تھی۔ بہت سے سرکاری ملازمین کو معتزلہ نے اس لیے برطرف کرایا کہ وہ معتزلی افکار کے مخالف تھے، اپنے مخالف علماء کو اذیتیں دیں، ظلم کا بازار گرم رکھا۔ پرویز صاحب اور تمام جدیدیت پسند معتزلہ کی اس تاریخ کو دانستہ چھپاتے ہیں۔

قرآن کی ماسٹر کاپی: پرویز صاحب کی غلط بیانی

''اس طرح یہ کتاب (قرآن) ساتھ کے ساتھ محفوظ ہوتی چلی گئی اور جب نبی اکرم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو یہ بعینہ اسی شکل اور اسی ترتیب میں جس میں یہ اس وقت ہمارے پاس ہے، لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود اور ہزاروں کے سینوں میں محفوظ تھی۔ اس کی ایک مستند کاپی (Master Copy) مسجد نبوی میں ایک ستون کے قریب، صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا جس میں نبی

اکرم ﷺ سب سے پہلے وحی لکھوایا کرتے تھے۔ اسے اُم یا امام کہتے تھے اور اس ستون کو جس کے قریب یہ نسخہ رہتا تھا، اسطوانہ مصحف کہا جاتا تھا اسی ستون کے پاس بیٹھ کر صحابہ کرامؓ نبی اکرم ﷺ کی زیرنگرانی اس مصحف سے اپنے اپنے مصاحف نقل کیا کرتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اس قدر عام ہوگئی تھی کہ جب نبی اکرم ﷺ نے اپنے آخری حج (حجۃ الوداع) کے خطبہ میں لاکھوں نفوس کو مخاطب کر کے پوچھا کہ میں نے تم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے؟ تو چاروں طرف سے یہ آواز گونج اٹھی کہ ہاں! آپؐ نے اسے پہنچا دیا ہے۔ یہی تھی وہ کتاب جس کے متعلق حضرت عمرؓ نے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں دیگر صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں فرمایا تھا کہ ''حسبنا کتاب اللّٰہ'' ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔'' (طلوع اسلام۔ص: ۱۱۔فروری ۱۹۸۲ء) تاریخی غلط بیانی ہے ایسے کسی نسخے کا وجود تاریخ میں نہیں ملتا۔ پرویز صاحب کو غلط بیانی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ وہ حدیث پر جتنے اعتراضات وارد کر چکے تھے ان سب کا اطلاق قرآن کی جمع وتدوین کے حوالے سے بھی ممکن تھا لہٰذا ان سے بچنے کے لیے یہ روایت وضع کی گئی کہ قرآن صندوق میں بند تھا۔

قرآن کو لغت سے متعین کرنا:

وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل ۱۶/۴۴) اے محمد ﷺ! ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو بوضاحت (الذکر لتفبین للناس) بتائیں جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا ہے:

پرویز صاحب لغت عرب اور محاورہ عرب کے ذریعے مفاہیم قرآن متعین فرمانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لغت میں مصلّی کے معنی ''وہ گھوڑا بھی ہیں جو گھڑ دوڑ میں اول نمبر پر آنے والے گھوڑے کے پیچھے پیچھے دوسرے نمبر پر آیا ہو'' ادائیگی صلوٰۃ کا مفہوم ہے۔ قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلنا''۔ صلوۃ ایک شرعی اصطلاح ہے اس کا مفہوم لغت عرب محاورہ عرب سے نہیں رسالت مآبؐ کے عمل اور صحابہ کے تعامل سے متعین ہوگا لیکن پرویز صاحب اس کے قائل نہیں وہ لفظیت پر اصرار کرتے ہیں اور رسالت مآبؐ کی شخصیت اسلامی تاریخ، روایات کو نظر انداز کر کے اسلام کی نئی تشریح پیش فرماتے ہیں۔ علامہ مشرقی صلوٰۃ کے معنی پر ڈکرنا بھی لیتے ہیں۔

اصلاحات قرآن کے مفاہیم: متضاد مطالب

پرویز صاحب نے لغت اور عقل کے ذریعے قرآن کی مختلف اصطلاحات کے مختلف اور متضاد مفاہیم معین فرمائے ہیں۔ ایک ہی اصطلاح مختلف معنوں میں کیسے استعمال ہوسکتی ہے؟ عدت کا مطلب عدت ہے اس کا مطلب اذان صلوۃ، حج نہیں ہوسکتا۔

۲۔ لفظ آخرت کے بھی چھ مفہوم ہیں۔ مستقبل بھی، کلی مفاد بھی۔ آخر الامر بھی، آنے والی نسلوں کا

مفاد بھی، حیات بعد الممات بھی اور حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں بھی۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے ایمان بالغیب]

۳۔ دنیا کا لفظ چار مفہوم ادا کرتا ہے۔ حال کی زندگی، ذاتی مفاد، مفاد عاجلہ اور موجودہ دنیا کی زندگی۔ [حوالہ ایضاً]

۴۔ دین کے چار مفہوم ہیں (۱) مکافات عمل [ن۔ر، ص۱۴۰]، (۲) بمعنی نظام ربوبیت [ایضاً ص۲۸۵]، (۳) نظام ربوبیت کا قیام [ایضاً، ص۱۱۵]، (۴) قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کا تحفظ، [لغات القرآن زیر عنوان ق۔د۔ر] اور (۵) قانون مکافات حق [ن۔ر، ص۱۴۸]

۵۔ صلوٰۃ کے مفاہیم یہ ہیں: (۱) صفات خداوندی کو بطور معیار سامنے رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلنا، (۲) نظام ربوبیت کی بار بار یاد دہانی کرتے رہنا، (۳) مسکین کو کھانا کھلانا اور (۴) مصلی وہ گھوڑا ہوتا ہے جو گھوڑ دوڑ میں اول نمبر پر آنے والے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے ارکان اسلام]

۶۔ زکوٰۃ کے تین مفہوم ہیں: (۱) اسلامی حکومت جو کچھ مسلمانوں سے لے لے وہ زکوٰۃ ہے، (۲) زائد از ضرورت مال مسلمان اسلامی حکومت کو دے دیں، (۳) اسلامی حکومت جو ضروریات زندگی لوگوں کو دے وہ زکوٰۃ ہے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے، قرآنی زکوٰۃ]

۷۔ ملائکہ کے مفہوم پانچ ہیں: (۱) خارجی قوائے فطرت، (۲) داخلی قوتیں، (۳) نفسیاتی محرکات، (۴) طبعی تغیرات اور (۵) پروں والے فرشتے سے مراد ان کی قوت ہے۔ جتنے پر زیادہ اتنی قوت زیادہ [تفصیل کے لیے دیکھیے، فرشتوں پر ایمان بالغیب] ان سب مفاہیم میں قدر مشترک یہ ہے کہ فرشتوں کا خارجی وجود اور ذاتی تشخص نہیں ہے۔

۸۔ لفظ جن کے پانچ مفہوم ہیں (۱) وہ آتشیں مخلوق جو انسان سے پہلے تھی، (۲) دیہاتی لوگ (۳) غیر مرئی قوتیں، (۴) انسانی جذبات (۵) ابلیس کی خوئے سرکشی۔

۹۔ لفظ شیطان کے تین مفہوم ہیں (۱) شیطان بمعنی شیطان [نظام ربوبیت ص۳۳۲]، (۲) بمعنی سرکش قوتیں [ایضاً ۲۱۹]، (۳) شیطان بمعنی ابلیسی معاشرہ [ایضاً ص۱۷۵]۔

۱۰۔ لفظ سماء کے ۱۵ مفہوم ہیں اور لفظ ارض کے ۱۶ مفاہیم بیان کیے ہیں۔ اس سے پرویز صاحب کے افکار میں تضادات، اختلافات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جن کون ہیں؟ پرویز صاحب کی متضاد تحقیقات

جنوں کے متعلق آپ نے جو تحقیق فرمائی ہے اس سے متعلق چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

پہلا اقتباس: جن ایک آتشیں مخلوق تھی جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا تھا۔ لفظ جن کے

معنی ہیں پوشیدہ، مستور، اوجھل، غیر مرئی۔ جب یہ کرۂ ارض سورج سے جدا ہوا تو ایک پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا۔ تبدل وتحول کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن وہ مخلوق اب قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی..... اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جس پر ہمارا ایمان ہے''۔ [ابلیس وآدم، ص ۹۷]

دوسرا اقتباس: جن وانس انسانوں کی ہی دو جماعتیں ہیں۔ انس شہروں کی مہذب آبادی اور جن صحرا کے بادیہ نشین، جو شہری آبادی کی نگاہوں سے اوجھل اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں جن وانس کا ذکر ہوگا ان سے مراد انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہوں گی۔ [ایضاً، ۱۰۸]

کیا جن سے مراد بجلی، غصہ ہے؟

تیسرا اقتباس: اب قابل غور مسئلہ یہ رہ گیا کہ جب جن قصہ پارینہ بن گئے تو پھر یہ کہاں سے آ گئے؟ یہ تحقیق بھی حاضر خدمت ہے۔

''ہر وہ قوت جو انسانی نگاہوں سے اوجھل ہو [مثلاً بجلی، حرارت، ہوا، مرتب] جن کہلاتی ہے اور انسانی جذبات چونکہ آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے۔ [مثلاً رحم، غصہ، خوش ذوقی، شفقت، مرتب] اس لیے اس اعتبار سے انھیں جن کہا گیا ہے''۔ [ایضاً، ص: ۹۰]

چوتھا اقتباس: اب جنوں کے ساتھ چونکہ ابلیس کا بھی تعلق ہے۔ اب پرویز صاحب جن کی تخلیق کو اس سے وابستہ فرماتے ہیں:

''ابلیس نے جو اپنے متعلق کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے تو اس سے اس کی خوئے سرکشی، کی طرف اشارہ تھا''۔ [ایضاً، ص: ۹۰]

پرویز صاحب: جن کے پانچ مطالب

گویا لفظ جن کے پانچ مفہوم ہوئے: (۱) آتشیں مخلوق جو انسان سے پہلے تھی اور اس پر ایمان لانا چاہیے۔ (۲) دیہاتی لوگ، (۳) غیر مرئی قوتیں، (۴) انسانی جذبات، (۵) ابلیس کی خوئے سرکشی باقی چار مفہوموں پر شاید ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔

حدیث کے جامعین کے اوصاف:

۱) پرویز صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ سب کے سب ایرانی تھے ان میں عرب کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ مقام حیرت ہے کہ عربوں میں سے اس عظیم کام کا کسی نے بھی بیڑا نہ اٹھایا اور احادیث کی جمع وتدوین کا کام غیر عربوں (عجمیوں) کے ہاتھوں سرانجام پایا''۔

۲) یہ تمام حضرات تیسری صدی ہجری میں ہوئے۔

۳) یہ تمام احادیث لوگوں نے انھیں زبانی سنائیں ان کا کوئی تحریری ریکارڈ اس سے پہلے موجود نہیں تھا۔''

پرویز صاحب کا غلط استدلال:

۱) دوسری صدی کے مدون حدیث ابنِ شہاب زہری کے علاوہ دس اور بھی ہیں لہذا پرویز صاحب کا یہ بیان کہ احادیث کی تدوین تیسری صدی میں ہوئی سراسر غلط بیانی ہے۔

۲) ان مدوّنین سے بیشتر عربی النسل ہیں، ایرانی نہیں۔

۳) دوسری صدی میں صرف ایک مجموعہ حدیث موطا امام مالک نہیں تھا بلکہ دوسری صدی میں آٹھ ایسے مجموعہ ہائے حدیث تیار ہوئے جو آج کل بھی متداول ہیں۔

پرویز صاحب کا دعویٰ ہے کہ جامعین حدیث سب ایرانی تھے [شاہکار رسالت ص ۵۰۳] ان کا دعویٰ درج ذیل حقائق کی روشنی میں غلط ہے:

	عرب محدثین		قبیلہ
۱۔	امام مالکؒ	۱۷۹ھ	ذی اصبح
۲۔	امام شافعیؒ	۲۰۴ھ	قریش
۳۔	امام حمیدیؒ	۲۱۹ء	قریش
۴۔	امام اسحٰق بن راہویہؒ	۲۳۸ء	بنوتمیم
۵۔	امام احمد بن حنبلؒ	۲۴۱ء	بنوشیبان
۶۔	امام دارمیؒ	۲۵۵ھ	بنوتمیم
۷۔	امام مسلمؒ	۲۶۱ھ	بنوقشیر
۸۔	امام ابوداودؒ	۲۷۵ھ	بنوازد
۹۔	امام ترمذیؒ	۲۷۹ھ	بنوسلیم
۱۰۔	حارث بن ابی اسامہؒ	۲۸۲ھ	بنوتمیم
۱۱۔	امام ابوبکر بزارؒ	۲۹۲ھ	بنوازد
۱۲۔	امام نسائیؒ	۳۰۳ھ	.....
۱۳۔	امام ابویعلیٰؒ	۳۰۷ھ	بنوتمیم
۱۴۔	امام ابوجعفر طحاویؒ	۳۲۱ھ	بنوازد
۱۵۔	امام ابن حبانؒ	۳۵۴ھ	بنوتمیم
۱۶۔	امام طبرانیؒ	۳۶۰ھ	لخم
۱۷۔	امام دارقطنیؒ	۳۸۵ھ	.....
۱۸۔	امام حاکمؒ	۴۰۵ھ	بنوضبہ

عجمی محدثین:

۱۔	امام ابن ابی شیبہؒ	۲۳۵ھ
۲۔	امام بخاریؒ	۲۵۶ھ
۳۔	امام ابن ماجہؒ	۲۷۳ھ
۴۔	امام ابن خزیمہؒ	۳۱۱ھ

مقامِ آدمیت اور مقامِ انسانیت؟ پرویز

[۱] جن کی صرف دنیا خوشحال ہو یہ لوگ کافر ہیں، ان کی آخرت تاریک ہے۔ کیوں تاریک ہے؟ اس لیے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ آپ کے خیال میں ایسے لوگ مقام آدمیت پر ہیں کیوں کہ آدم کو ملائکہ یعنی کائناتی قوتوں نے سجدہ کیا تھا لہذا صرف متمدن اقوام مغرب ہی مسجود ملائک اور مقام آدمیت پر فائز ہیں۔

[۲] جن کی دنیا بھی خوشحال ہو اور آخرت بھی تابناک، یہ مومنین ہیں۔ آخرت پر ایمان کے باوجود بھی اگر ان کی دنیا خوشحال نہ ہو تو یہ مومن نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ مقامِ انسانیت پر ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کافروں کو بھی انسان کہتا ہے۔ (۶۔۸۳) قرآن کی بے شمار آیات پرویز صاحب کے موقف کی بھرپور تردید کرتی ہیں، خصوصاً حضرت موسیٰ، حضرت نوحؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق آیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ صاف لفظوں میں فرماتا ہے کہ آپ کے مخالفین کو دنیا سے جو کچھ دیا گیا ہے اس کی پروا نہ کریں بلکہ اگر تمام لوگوں کے کافر ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم کفار کے گھر اور چھتیں سونے کی بنا دیتے۔ [الزخرف ۳۳] قرآن کی بے شمار آیات میں انبیاء کے مقابلے پر کفار کی دنیاوی شان وشوکت اور خوش حالی کا ذکر ہے اور انبیاء کو اس صورت حال پر تاسف سے رکنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مثلاً الحجر آیت ۸۸، طٰہٰ آیت ۱۳۱، القصص آیت ۵۸، الحجرات آیت ۳۷، ھود آیت ۱۲، الحج آیت ۱۵، یہ عجیب تصور ہے کہ کامیاب انسان وہ ہے جو دنیا میں لازماً خوش حال ہو، یہ خالص مغربی تصور ہے۔ جس کا تعلق فلاح [Progress] وترقی [Development] کی مغربی گمراہیوں سے براہ راست تعلق ہے۔

[۳] جن کی دنیا بھی تاریک ہے اور آخرت بھی یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتے ہیں۔ یعنی جیسے آج مسلمانوں کی ''مذہب پرست'' قوم ہے۔ یہ لوگ مقامِ آدمیت سے بھی ادنیٰ سطح پر ہیں کیوں کہ کائناتی قوتیں ان کے آگے سجدہ ریز نہیں۔ [اسباب زوال امت، ۸۶]

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (الفاطر ۳۵/۲۸) ''اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو عالم ہیں''۔

ان آیات سے پرویز صاحب یہ نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ ان آیات میں نباتات، جمادات اور حیوانات کا ذکر ہے اور یہی تینوں چیزیں علم سائنس کی بڑی بڑی شاخیں ہیں لہذا ان علوم کے ماہر ہی حقیقتاً

'عالم' ہیں، جنھیں آج کی اصطلاح میں ''سائنٹسٹ'' کہا جاتا ہے۔ (اسباب زوالِ امت۔ص: ۱۰۵)
پرویز صاحب یہاں پروٹسٹنٹ ازم کے علمبردار نظر آتے ہیں جن کی اخلاقیات کے مطابق جو دنیا میں کامیاب ہے وہی آخرت میں بھی کامیاب ہے۔ لہٰذا دنیا کا سب سے کامیاب شخص بادشاہ وقت ہے جو اللہ کا منتخب بندہ بلکہ ظل الٰہی ہے۔ پروٹسٹنٹ ازم نے اس نظریے کے ذریعے سرمایہ داری کی بھرپور حمایت کی اور امیر آدمی کو دنیا میں اللہ کے خاص بندوں کا درجہ دیا، لہٰذا ہر بندہ بندہ زر بننے پر مجبور ہوگیا، اگر سائنس داں عالم ہیں تو یہ عابد کیوں نہیں ہیں؟ یہ عبدیت للّٰہیت روحانیت سے محروم کیوں ہیں؟ پرویز صاحب یہ نہیں بتاتے کہ یہ سائنس داں خشیت اللہ سے کیوں محروم ہیں ان کی زندگی یادِ الٰہی میں کیوں بسر نہیں ہوتی اور یہ اللہ کی حاکمیت پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ علم تو اللہ کی ہستی کے اقرار کا دروازہ کھولتا ہے یہ کیسا علم ہے جو یہ دروازہ بند کر دیتا ہے۔

وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ''اور علم ہونے کے باوجود اس کی بدروی کی بنا پر اللہ نے اسے گمراہ کر دیا ہے''۔ (الجاثیۃ ۴۵/۲۳)

حقیقی علم ہے کیا ہے؟ قرآن نے قارون کا ذکر کیا ہے جو دولت کو اپنے علم کا باعث سمجھتا تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ قرآن میں اس شخص کا بھی ذکر ہے جو عالم تھا لیکن خواہش نفس کو اس نے الٰہ بنالیا گمراہ ہوگیا، کمثل الحمار یحمل اسفاراً کا بھی ذکر ہے ان کا بھی ذکر ہے جن کو کتے سے تشبیہہ دی گئی ہے یہ سب اہل علم تھے۔ لیکن جب ان کا علم کائنات کی حقیقت کے بجائے طلب دنیا اور خواہش نفس کے لیے وقف ہوگیا تو یہ علم محض جہل ہوگیا۔ قرآن نے ہر ہر مقام پر لفظ علم کا اطلاق وحی الٰہی پر کیا ہے اور ایسی آیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کے حوالہ کی ضرورت نہیں لہٰذا جو علوم خشیت اللہ کا سبب بنتے ہیں وہ علم کا اعلیٰ درجہ ہے اور جو علوم خشیت اللہ کا سبب تو نہیں بنتے مگر انسانیت کے لیے مفید ہیں، ان پر بھی علم کا اطلاق ہوسکتا ہے اور جو علوم خدا سے دور کر دیں تو وہ علم نہیں بلکہ ضلالت ہے۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کی نئی تشریح:

''اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے جس میں اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکز ملت ہے اور اولی الامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو امر متنازع فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دو، اسے مرکزی حکومت کی طرف (Refer) کر دو۔ مرکز کا فیصلہ سب کے لیے واجب التسلیم ہوگا۔ یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف عدالت عالیہ میں مرافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے''۔ (معراجِ انسانیت۔ص: ۲۶۵۔۶۲۶) جن خلفائے راشدین کو پرویز صاحب مرکز ان ملت قرار دے کر اللہ اور رسولؐ کی گدی پر براجمان کر کے انھیں یہ اعزاز عطا فرما رہے ہیں ان کو خود ساری عمر اس اعزازی مسند کی خبر تک نہیں ہوئی۔ یہ مرکز ملت (مثلاً حضرت عمر

ؓ اور حضرت علیؓ) خود عدالتوں میں حاضر ہوئے اور لطف کی بات یہ ہے کہ فیصلے بھی ان کے خلاف ہی ہوئے۔ انھیں اس بات کی سمجھ ہی نہ آئی کہ اللہ اور رسول تو ہم خود ہیں، ہماری اطاعت ہی اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرکز ملت کی شخصیت بھی اولوالامر میں شامل ہے۔ جن سے جھگڑا کیا جا سکتا ہے وہ اللہ اور رسول نہیں بن جاتے، کیونکہ ان سے تو اختلاف اور جھگڑا ایمان سے ہی خارج کر دیتا ہے جب کہ اولوالامر سے اختلاف اور جھگڑا ہونے سے ایمان میں کچھ حرج واقع نہیں ہوتا۔

مرکزِ ملت قطعاً عدالت مرافعہ نہیں۔ اگر ایسی ہی بات ہوتی تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو عدالت میں حاضر ہونے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

عدالتِ مرافعہ (جیسی اور جس درجہ کی بھی ہو) وہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ اس پر مرکزِ ملت کی شخصیت اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ یہ عدالت آزادانہ فیصلے کرتی ہے۔

قرآنی حکومت نماز تبدیل کر سکتی ہے:

پرویز صاحب نے فرمایا کہ ''زمانہ کے تقاضے زکوۃ پر تو اثر انداز ہو سکتے ہیں لیکن نماز پر یہ تقاضے اثر انداز نہیں ہوتے آخر وہ کونسی ضرورت اس بات کی مقتضی ہوگی کہ رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کی جگہ سُبْحَانَ اللہِ تَعَالیٰ عَمَّا یَصِفُوْنَ پڑھا جائے یا دو سجدوں کی بجائے صرف ایک سجدہ کیا جائے۔ لہٰذا جو اعمال ملت میں تواتر سے چلے آ رہے ہیں انھیں علی حالہ رہنے دیا جائے گا۔ البتہ جن جزئیات میں مختلف فرقوں میں اختلاف ہے قرآنی معاشرہ ان کو بتدریج ختم کر دے گا۔ تاہم اگر یہ قرآنی حکومت ان مسلمہ جزئیات (یعنی نمازوں کی تعداد رکعات کی تعداد، اوقات نماز اور ترکیب نماز) میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہوگی۔ (قرآنی فیصلے، صفحہ: ۱۲ تا ۱۴ ملخصاً)

اس سے پہلے پرویز صاحب کا مؤقف یہ تھا کہ موجودہ طریقہ نماز ٹھیک ہے اور میں حنفی طریقے سے نماز پڑھتا ہوں، پندرہ سو سال کے بعد اب نماز بھی تبدیل ہو جائے گی جب کہ پرویز صاحب اسے امت کا شعار تسلیم کر چکے تھے۔

اطاعتِ والدین قرآن کی رو سے غیر ضروری ہے: پرویز صاحب

قرآن کو دیکھیے کہ اس نے دنیا میں پہلی بار یہ آواز بلند کی ہے جو لوگ عقل کے انحطاط کے دور میں جا چکے ہوں ان کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔ ماں باپ حسنِ سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس جب تک بچہ بچہ ہے اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لیے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے مشورہ فائدہ تو اٹھا سکتا ہے لیکن اسے ان کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا''۔ (قرآنی فیصلے ص ۱۲۸)

بڑھاپے میں بھی اطاعت والدین ضروری ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَاتُؤْمَرُ (الصافات ۳۷/۱۰۲)

تو جب حضرت اسماعیلؑ اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کے کاموں میں حصہ لینے کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا ''اے میرے پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تم دیکھو کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت اسماعیلؑ نے کہا اے میرے باپ جو آپ کو حکم ہوا وہی کچھ کیجیے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جب حضرت ابراہیمؑ بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت اسماعیلؑ عاقل و بالغ ہو چکے تھے۔ ان میں کم از کم اتنا عقل و شعور آ چکا تھا کہ ان سے رائے لی جا سکے۔ اللہ کا حکم حضرت ابراہیمؑ کو ہوا تھا حضرت اسماعیلؑ کو نہیں ہوا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود حضرت اسماعیل نے والد کی اطاعت کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی نہ اس واقعہ سے پہلے اور نہ اس کے بعد، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے سے بھی انکار نہیں کیا اور یہ نہیں سوچا کہ یہ تو خواب کی بات ہے یا یہ کہ نعوذ باللہ والد محترم بوڑھے ہو گئے ہیں، جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ پرویز صاحب نوجوان نسل کو خوش کرنے کے لیے اطاعت والدین سے انھیں آزاد کرنا چاہتے ہیں۔

ایک وقت میں صرف ایک نکاح جائز ہے: پرویز صاحب

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّکَانَ زَوْجٍ وَ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ (النساء ۴/۲۰)

''اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو تو پہلی بیوی کا مہر پورا پورا ادا کر دو اور پھر اس کی جگہ دوسری لاؤ''۔

''اس سے بالکل واضح ہے کہ ایک بیوی کی جگہ ہی دوسری بیوی آ سکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں''۔ (طاہرہ کے نام خطوط ص ۳۱۸)

مندرجہ بالا آیت میں جناب پرویز صاحب نے اِحْدٰهُنَّ کا ترجمہ نہیں کیا۔ هُنَّ ضمیر جمع مونث ہے۔ جو تین یا تین سے زیادہ عورتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے اور مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ یوں بنتا ہے کہ جو تمہارے پاس تین یا تین سے زائد بیویاں زائد ہیں ان میں سے اگر تم کسی ایک کو بدلنا چاہو تو اس کو اس کا حق مہر ادا کر چکے ہو۔

عام حالات میں ایک ہی نکاح ہو سکتا ہے: پرویز صاحب

لیکن جب اس آیت کو فواحدہ والی آیت کی روشنی میں پڑھا جائے تو اس سے یہی مترشح ہوتا

ہے کہ عام حالات میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں۔ (قرآنی فیصلے ص ۱۴۸)

پرویز صاحب کا یہ موقف قرآن کی بے شمار آیات کے خلاف اور مغرب کو خوش کرنے کے لیے ہے کہ اسلام میں تعدد ازواج نہیں ہے جب کہ مغرب میں شادی کا مسئلہ ہی نہیں اسے تعدد ازواج پر اعتراض ہے صبح وشام زنا کاری پر کوئی اعتراض نہیں لیکن مغرب کے لیے اسلام کو جدید بنانا ضروری ہے۔

چوری کی سزا کے لیے حدیث سے استدلال:

پرویز صاحب ہر معاملے کا فیصلہ قرآن سے کرتے ہیں لیکن نماز کے معاملے میں فقہ حنفی کے مقلد ہیں اور چوری کی سزاؤں کے بارے میں سنت اور احادیث پر انحصار کرتے ہیں لیکن سنت کو ماخذ قانون بھی نہیں مانتے۔ چوری کی سزا قطع ید ہے یہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے جو قرآن نے متعین کی ہے کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری کے جرم میں مجرم اس سزا کا مستحق ہوگا اور کن حالات میں اس سے کم سزا کا سزاوار ہوگا۔ اس کے متعلق فقہ اور روایات دونوں میں تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ روایات (مسلم اور بخاری) میں ہے کہ دینار سے کم کی چوری میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ فقہ میں اس کو نصاب کہتے ہیں بعض کے نزدیک نصاب ایک دینار ہے اور بعض کے نزدیک ربع (ایک چوتھائی) دیناری یہ تو رہا مقدار کا سوال۔ اب لیجیے احوال وظروف کو، فقہ کی رو سے چور کو اس تک قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی جب اس نے کسی محفوظ جگہ سے نہ چرایا ہو''۔ (قرآنی فیصلے ص ۱۶۶) اسی لیے امام شاطبی نے الموافقات میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ السنۃ قاضیہ کا صحیح مطلب کیا ہے؟ جب کہ منکرین حدیث السنۃ قاضیہ علی الکتاب کا دوسرا مفہوم پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد مال محفوظ کی تعریف میں ''سارق کسے کہتے ہیں'' کے ذیلی عنوان کے تحت نسائی کی ایک روایت اور روایت حضرت عمرؓ کا قول اور امام ابن حزم کا ایک قول بطور حجت پیش فرمارہے ہیں اور نتیجہ یہ پیش فرمارہے ہیں کہ پہاڑوں پر آوارہ چرنے پھرنے والے جانوروں میں سے اگر کوئی جانور لے جائے تو وہ چور نہیں ہوتا۔ بھوکا شخص باغ سے پھل توڑ کر کھالے تو وہ بھی چور نہیں ہوتا۔ قحط کے زمانے میں چوری کرنے والا بھی چور نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان پر قطعِ ید کی حد جاری نہیں ہوگی۔ البتہ قاضی جرم کی نوعیت کے مطابق اسے سزا دے سکتا ہے۔ (قرآنی فیصلے ص ۱۶۶) جب احادیث پرویز صاحب کے موقف کی تائید میں ہوں تو ان کا استعمال ایمان کا تقاضہ بن جاتا ہے جب پرویز صاحب کے موقف کی تردید ہورہی ہو تو احادیث کو عجمیوں کی اختراع قرار دیا جاتا ہے۔

سنت کے بغیر قرآن کی تفصیل ممکن نہیں؟

چوری کے مسئلے میں پرویز صاحب حدیث وسنت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئے، قرآن کی تفصیل سنت اور صاحب قرآن کی تعمیل کے بغیر ممکن نہیں اسی لیے سنت، ماخذ قانون بن جاتی ہے، اگر سنت وحدیث کو ترک کردیا جائے تو پرویز صاحب مندرجہ ذیل سوالات کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔

منکرین حدیث کیا ان سوالات کا جواب دے سکتے ہیں؟

انکار حدیث کے لیے سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہ تلاش کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ

کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے، اس لیے حدیث کی ضرورت نہیں۔ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کے متعلق **تبیانا لکل شیئی** اور **تفصیلا لکل شیئی** والی آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جن کا مطلب توڑ مروڑ کر اور خلط ملط بیان کر کے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ قرآن میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے۔ جبکہ تفصیل سنت بتاتی ہے سنت قرآن پر قاضی ہے کا یہی مفہوم ہے جو امام شاطبیؒ نے نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔

[۱] قرآن میں مردہ، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور حرام قرار دیا گیا ہے اور **بھیمۃ الانعام** حلال کیا گیا ہے۔ بھیمۃ الانعام کی تفسیر قرآن میں ان جانوروں سے کی گئی ہے: اونٹنی، اونٹ، گائے، بیل، بکری، بکرا، بھیڑ اور مینڈھا۔ لغت میں بھی بھیمۃ الانعام کی فہرست میں یہی جانور بتائے گئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے علاوہ دنیا کے بقیہ جانور حلال ہیں یا حرام؟ مثلاً کتا، بلی، گیدڑ، بھیڑیا، چیتا، شیر، تیندوا، بندر، ریچھ، ہرن، چیتل، سانبھر، بارہ سنگھا، بھینسا، خرگوش، کوا، چیل، باز، شکرہ، کبوتر، مینا، فاختہ وغیرہ وغیرہ یہ سارے جانور حلال ہیں یا حرام؟ یا ان میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام؟ ظاہر ہے اس کا جواب قرآن سے نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا جواب قرآن نہیں صاحب قرآن دے گا اور اس کا قاعدہ حدیث بیان کرے گی۔

کیا قرآن نماز کی تفصیلات بتاتا ہے؟

[۲] قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز کی حالت میں کھڑے ہونے، رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوں یا پہلے رکوع کریں یا پہلے سجدہ کریں؟ پھر کھڑے ہوں تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں یا لٹکا کر؟ ایک پاؤں پر کھڑے ہوں یا دونوں پر؟

لغت میں ''رکوع'' کا معنی ہے جھکنا، سوال یہ ہے کہ آگے جھکیں، یا دائیں جھکیں یا بائیں جھکیں؟ پھر جھکنے کی مقدار کیا ہو؟ ذرا سا سر نیچا کریں یا کمر کے برابر نیچا کریں یا اس سے بھی زیادہ نیچا کریں؟ پھر رکوع کی حالت میں ہاتھ کہاں ہوں؟ گھٹنوں پر ٹیکیں؟ یا دونوں رانوں کے بیچ میں رکھ کر بازوؤں کو ران پر ٹیکیں؟ یا ڈنڈے کی طرح لٹکنے دیں؟

اسی طرح سجدہ کیسے کریں؟ یعنی زمین پر سر کا کون سا حصہ ٹیکیں، پیشانی کا ٹھیک پچھلا حصہ یا دایاں کنارہ یا بایاں کنارہ؟ سجدہ کی حالت میں ہاتھ کہاں رکھیں؟ یا زمین پر ٹیکیں؟ اور اگر زمین پر ٹیکیں تو صرف ہتھیلی زمین پر ٹیکیں یا پوری کہنی زمین پر ٹیکیں؟ سجدہ ایک کریں یا دو کریں؟ قرآن سے ان سوالات کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ سنت و حدیث کے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل نہیں ہو سکتا۔

زکوٰۃ کی تفصیلات کیا قرآن میں ہیں؟

[۳] قرآن میں زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ دینے والوں کو سخت عذاب کی دھمکی

بھی دی گئی ہے جس جس قسم کے لوگوں پر زکوٰۃ خرچ کرنی ہے، انھیں بھی بتا دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کب کب وصول کی جائے؟ یعنی زکوٰۃ روز روز دی جائے؟ یا سال بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ یا پانچ سال یا دس سال یا بیس سال میں ایک مرتبہ دی جائے؟ یا عمر بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ پھر یہ زکوٰۃ کس حساب سے دی جائے اور کتنی کتنی دی جائے؟ یعنی غلہ کتنا ہو تو اس میں زکوٰۃ دی جائے؟ اور کتنے غلہ پر کتنی زکوٰۃ دی جائے؟ سونا چاندی کتنی ہو تو زکوٰۃ دی جائے؟ اور کس حساب سے دی جائے؟ کیا یہ سارے مسئلے قرآن سے ثابت کیے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تو ثابت ہوا کہ سنت حدیث کو مانے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان سارے مسائل کا بیان حدیث ہی میں آیا ہے۔

[۴] قرآن میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مالِ غنیمت حاصل کریں، اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ باقی چار حصے کیا کیے جائیں؟ تمام مجاہدین پر برابر برابر بانٹ دیئے جائیں یا فرق کیا جائے؟ کیونکہ بعض لوگ اپنا ہتھیار، گھوڑا، تیر، کمان، نیزہ، بھالا، زرہ، خود، سواری کا جانور اور کھانے کا سامان خود لے کر جاتے تھے اور بعض کو اسلامی حکومت کی طرف سے یہ سامان فراہم کیا جاتا تھا۔

اسی طرح بعض لوگ بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑتے تھے، بعض دبکے رہتے تھے، کچھ اگلی صف میں رہتے تھے، جن پر براہِ راست دشمن کا وار ہوتا تھا۔ کچھ پیچھے رہتے تھے جو خطرہ سے دور رہتے تھے۔ اب اگر ان سب کو برابر دیں تو کیوں دیں؟ اور اس کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے؟ اور اگر فرق کریں تو کس حساب سے فرق کریں؟ قرآن سے اس کا حساب بتایئے اور اگر سالار کی رائے پر چھوڑ دیں تو قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ سالار کی رائے پر چھوڑ دیں؟ اس کی دلیل دیجیے۔ اگر قرآن میں ان مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہے تو کیسے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں سارے مسئلے بیان کر دیئے گئے ہیں.....!!

[۵] قرآن میں حکم ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کاٹیں یا ایک ہاتھ؟ اور اگر ایک ہاتھ کاٹیں تو داہنا کاٹیں یا بایاں؟ پھر اسے کاٹیں تو کہاں سے کاٹیں؟ بغل سے یا کہنی سے یا کلائی سے؟ یا ان کے بیچ میں کسی جگہ سے؟ آپ کو جواب بھی دیں، اس کا ثبوت قرآن سے دیں اور اگر قرآن سے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تو کیسے کہتے ہیں کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔

[۶] قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ جب جمعہ کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ سوال یہ ہے کہ جمعہ کے دن کب پکارا جائے؟ کس نماز کے لیے پکارا جائے؟ کن الفاظ کے ساتھ پکارا جائے؟ جس نماز کے لیے پکارا جائے، وہ نماز کیسے پڑھی جائے؟ ان ساری باتوں کا ثبوت قرآن سے دیجیے۔ ورنہ تسلیم کیجیے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو باتیں ہم نے پوچھی ہیں ان باتوں میں اور اسی طرح زندگی کے بہت سارے مسئلے میں تنہا قرآن سے کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ یہ طریقہ صرف سنت وحدیث سے معلوم ہوسکتا ہے۔ اس لیے جب تک سنت وحدیث کو نہ مانیں، خود قرآن پر بھی عمل نہیں کر سکتے۔

اگر احادیث حجیت نہیں ہیں تو مندرجہ ذیل سوالات کا جواب ہمیں کہاں سے ملے گا؟

مردہ مچھلی کیا قرآن سے حلال ثابت ہوتی ہے؟

قرآن کریم نے میتۃ یعنی ازخود مرجانے والے جانور کو قرار دیا ہے؟ اب منکرین حدیث سے سوال ہے کہ مچھلی جب پانی سے باہر آتی ہے تو مرجاتی ہے، تو اس کا کیا حکم ہے۔ اس کی حلت کو قرآن سے ثابت نہیں کر سکتے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو ماننا پڑے گا۔

اُحلت لنا میتتان: السمک والجراد [مسند احمد: ۲/۹۷، فتح الباری: ۹/۶۲۱]

''اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے دو مردار حلال قرار دیئے ہیں: مچھلی اور مکڑی''

مردہ جانور خون خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جانور حرام قرار دیا گیا ہے اور بہیمۃ الانعام اب بتائیے کہ کہ کتا، بلی، گیدڑ، شیر، چیتا، ہاتھی، ریچھ، شکرا حلال ہیں یا حرام قرآن کریم میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ:

''مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کے علاوہ قرآن میں کھانے والوں کے لیے کوئی چیز حرام نہیں پاتا''۔ [الانعام: ۱۴۵]

یہ امثال پرویز صاحب کے اس موقف کی تردید کے لیے کافی ہیں کہ دین پر عمل کے لیے سنت و حدیث کی کوئی ضرورت نہیں۔

کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر [مسند احمد: ۱/۳۳۲، ۴/۱۹۳]

''ہر کچلی والا جانور اور ہر پنجے سے شکار کرنے والا پرندہ حرام ہے''۔

منکرین حدیث اور ابن قتیبہؒ کے حوالے:

ابن قتیبہؒ پہلے خود معتزلہ سے متاثر اور ان کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ پھر جب انھیں معتزلہ کی جسارت اور احادیث صحیحہ کو بھی رد کرنے کا علم ہوا اور دیکھا کہ وہ قرآن کی تفسیر دوسری قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر اپنے عقائد باطلہ کے ہم آہنگ بنا لینے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ ان سے الگ ہوگئے۔ ''مختلف الحدیث'' میں ابن قتیبہ نے معتزلہ کے پوشیدہ عیوب ونقائص کو طشت از بام کیا ہے۔ سب سے پہلے نظام معتزلی کا ذکر کیا ہے جس

نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سب کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ پھر ان اعتراضات کا ازالہ کیا ہے اس کے بعد مشہور معتزلین ابو ہذیل علاف، عبیداللہ بن حسن اور ہشام بن حکم کا ذکر کر کے ان کی یاوہ گوئی اور تناقضات پر تبصرہ کیا ہے۔ بعد ازاں معتزلین کے خطیب جاحظ کا ذکر کیا ہے کہ جھوٹا آدمی تھا۔ خود حدیثیں وضع کرتا تھا اور صحیح حدیثوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ پھر اس کے بعد معتزلہ کے دیگر مزعومات باطلہ اور عجیب وغریب اقوال درج کیے ہیں اور متعارض حدیثوں کی توجیہہ پیش کی ہے۔

بدترین علمی خیانت:

امام ابن قتیبہ کی یہ کتاب منکرین حدیث کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی وہ اس کتاب سے حدیث پر اعتراضات ومطاعن توبعینہ نقل کر دیتے ہیں مگر ان کے جو جوابات ابن قتیبہ نے دیئے ہیں یا ان پر جو جرح یا تبصرہ کیا ہے اسے مطلقاً نظر انداز کر جاتے ہیں اور اعتراضات بھی اس انداز سے پیش کرتے ہیں گویا یہ صحابہ واہل حدیث کے بارے میں ابن قتیبہ کے ذاتی افکار وآراء ہیں۔ منکرین حدیث کو جامع بیان العلم کے ۱۸۳ ابواب میں سے مندرجہ ذیل چار باب بہت پسند ہیں:

۱۔ **کراھیة کتابة العلم و تخلیدہ فی الصحف** یعنی علم کو لکھنے کی اور اسے ہمیشہ لکھا رکھنے کی ناپسندیدگی۔'' کیونکہ بعض صحابہ حدیث حفظ ہو جانے کے بعد اسے مٹا دیتے تھے۔

۲۔ ''**اختلاف العلماء فی بعض الفروع**'' یہ باب ان فروعی اختلاف کو اچھال کر احادیث سے برگشتہ کرنے کے لیے بہترین مواد کا کام دیتا ہے۔

۳۔ **من ذم الاکثار من الحدیث بغیر تفھیم و تفقہ** یعنی ان لوگوں کے اقوال جنھوں نے حدیث میں فہم وتفقہ پیدا کیے بغیر تکثیر روایت کی مذمت کی ہے۔

۴۔ ''**لایقبل قول بعض العلماء فی بعض الابینة**'' یعنی ایک عالم کی دوسرے عالم کے حق میں جرح بغیر دلیل کے ناقابل قبول ہے۔ اس باب کے عنوان سے صرف نظر کر کے منکرین حدیث صرف وہ اقوال درج کر دیتے ہیں جو کسی عالم نے دوسرے کے خلاف کہے اور اس طرح جرح اور تعدیل کے فن کو بے کار ثابت کرتے ہیں اس کتاب کے باقی ۱۷۹ ابواب منکرین حدیث کے خیال میں بے کار اور ناقابل التفات ہیں۔

اسی طرح توجیہہ النظر میں تیسری فصل [ص ۱۱، تا ۱۹] منکرین حدیث کے لیے بڑے کام کی چیز ہے اس کا عنوان ہے ''**الفصل الثلث فی تثبت السلف فی امر الحدیث خشیة ان یدخل فیہ مالیس منہ** یعنی حدیث کے معاملہ میں سلف کی تحقیق اس خدشہ کے پیش نظر کہ مبادا حدیث میں وہ شامل نہ ہو جائے جو حقیقتاً

اس میں شامل نہیں۔

یہی صورت تذکرۃ الحفاظ للذہبی کی ہے۔ان تمام کتابوں سے مصنف کی منشاء کے علی الرغم عبارتیں نقل کر کے اس کا غلط سلط مطلب عوام کے سامنے پیش کر کے انھیں حدیث سے بدظن اور برگشتہ کرنے کا فریضہ منکرین حدیث مدتوں سے سرانجام دے رہے ہیں۔

حدیث وسنت کے تحفظ کے لیے علماء کی قربانیاں:

منکرین حدیث کبار علماء کو دربار ملوکیت کا خادم قرار دیتے ہیں جب کہ ملوکیت کے خادم معتزلہ تھے جو اسی برس تک عباسی سلطنت کی حمایت سے اپنے افکار مسلط کرنے میں ناکام رہے اور آخر تاریخ سے مٹ گئے۔ معتزلہ پرویز صاحب اور منکرین حدیث کا پسندیدہ گروہ ہے اور پرویز صاحب اسلام کا عروج معتزلی فکر کے احیاء میں دیکھتے ہیں جب کہ معتزلہ کے اسی سالہ اقتدار کی تاریخ ظلم و جبر وتشدد کی تاریخ ہے۔علماء نے حدیث کی حفاظت کے لیے جو قربانیاں دیں اس کی جھلک دیکھیے:

[۱] معتزلہ نے خلق قرآن کا مسئلہ پیدا کیا تو اس کے خلاف بہت سے علماء نے جان کی قربانی دی اور امام احمد بن حنبلؒ نے مدتوں قید و بند اور مار پٹائی کی صعوبتیں جھلیں۔

[۲] عباسی خلفاء نے اپنی سلطنت کے سیاسی استحکام کے لیے ایک موضوع حدیث کا سہارا لیا کہ جو کوئی خلیفہ کی بیعت توڑے اس کی بیوی کو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔امام مالکؒ نے اس طرح کی جبری طلاق کے خلاف فتویٰ دیا تو انھیں اس جرم کی پاداش میں شتر پر سوار کر کے تمام شہر میں پھرایا گیا۔اس حالت میں بھی آپ ببانگ دہل کلمہ حق کا اعلان کرتے رہے۔

[۳] امام شعبیؒ [۱۷ھ تا ۱۰۴ھ] جو پہلی صدی میں اہل عراق کے مایہ ناز عالم حدیث تھے،خلیفہ عبدالملک جو خود بھی ماہر عالم حدیث تھا کے بلانے پر اس کی ملاقات کو گئے۔راستہ میں تدمر کے مقام پر نماز کا وقت آیا تو مسجد میں چلے گئے، یہاں کا خطیب قصہ گو تھا جو مسجد میں مجلس جمائے بیٹھا تھا اور لوگوں سے حدیث بیان کر رہا تھا کہ اللہ نے دو صور پیدا کیے ہیں،ایک بے ہوش کرنے اور دوسرا اٹھانے کے لیے اور ان میں دو بار پھونکا جائے گا۔امام شعبی نے نماز ختم کر کے اس قصہ گو سے کہا اے شیخ اللہ سے ڈرا اور غلط حدیث بیان نہ کر۔امام صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس قصہ گو نے امام موصوف کو جوتے سے پیٹنا شروع کر دیا اور کہا اے فاجر! میں فلاں شخص سے حدیث سناتا ہوں اور تو مجھے جھٹلاتا ہے۔اس شیخ کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی پٹائی میں شریک ہو گئے اور اس وقت تک پٹائی سے نہ رکے جب تک کہ امام موصوف سے یہ اقرار نہ لے لیا کہ خدا نے دو کیا تیس صور پیدا کیے ہیں۔یہ پٹائی محض ایک غلط حدیث سے روکنے کی بناء پر ہوئی۔پھر جب آپ دمشق پہنچے تو خلیفہ نے علیک سلیک کے بعد کہا کہ اپنے سفر کا کوئی عجیب

واقعہ سنایئے امام شعبی نے یہ واقعہ سنایا تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیا۔تحذیر الخواص للسیوطی ص ۵۱ بحوالہ تاریخ المحدثین ص ۱۶۵]

[۴] اس طرح کا ایک واقعہ امام ابن جریر طبری سے پیش آیا۔ بغداد میں ایک قصہ گو مقام محمود کی تفسیر میں کہہ رہا تھا کہ قیامت کے دن رسولؐ اللہ، اللہ کے ہم نشین ہوں گے اور اس کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے۔ امام موصوف نے اس کی مخالفت کی اور اپنے دروازہ پر لکھ دیا کہ ''اللہ کا کوئی ہم نشین نہیں'' عوام ایسے قصہ گو لوگوں سے اتنے متاثر تھے کہ بھپرے ہوئے امام موصوف کے گھر پہنچے تو آپ نے دروازہ بند کر لیا۔ان لوگوں نے اس قدر پتھراؤ کیا کہ دروازہ کا منہ ڈھک گیا۔

[۵] اسی طرح کا ایک واقعہ یحیٰی بن معین اور احمد بن حنبلؒ کو پیش آیا۔ یہ دونوں حضرات ہم عصر نقد و جرح کے امام زمانہ اور عظیم محدث تھے۔ایک دفعہ ان دونوں نے بغداد کی مسجد رصافہ میں نماز پڑھی۔خطیب صاحب ایک طویل حدیث معہ سند بیان فرمانے لگے کہ میں نے سنا یحیٰی بن معین اور احمد بن حنبلؒ سے انھوں نے رسول اللہؐ سے کہ جب کوئی بندہ لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اللہ اس کلمہ کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پر زمرد کے۔تآخر یہ روایت سن کر دونوں امام بڑے حیران اور استفہامیہ نشان بنے ہوئے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔قصاص کی بات ختم ہوئی تو یحیٰی بن معینؒ نے قصاص کو بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟'' وہ کہنے لگا ''یحیٰی بن معین اور احمد بن حنبل سے'' یحیٰی بن معین کہنے لگے کہ ''میں یحیٰی بن معین اور یہ احمد بن حنبل ہیں اور ہم نے اس روایت کو سنا تک نہیں'' وہ کہنے لگا میں نے سنا تھا یحیٰی بن معین احمق ہے۔آج اس کی تصدیق ہوگئی۔''یحیٰی بن معین کہنے لگے ''وہ کیسے؟'' اس نے کہا کہ ''سترہ یحیٰی بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل ہیں جن سے میں روایت کرتا ہوں۔ دنیا میں بس تم اکیلے ہی یحیٰی بن معین رہ گئے ہو؟'' یہ سن کر انھوں نے آستین منہ پر رکھ لی اور چپ چاپ چلے آئے۔

محدثین کا اصل کارنامہ:

یہ اور کئی ایسے دوسرے واقعات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مختلف طبقہ سے تعلق رکھنے والے وضاعین اور متبدعین نے ان محدثین کا کس قدر ناک میں دم کر رکھا تھا۔ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے محدثین کی وہ جماعت پیدا کی جس نے احادیث کی تحقیق کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔فن تنقید میں نہایت سخت اصول وضع کیے اور ہر امام نے ان پر مستقل تصانیف لکھیں اور حق کو باطل سے الگ کیا اس کام پر انھیں کتنی محنت کرنی پڑی۔اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو امام داؤد سجستانی نے اہل مکہ کے نام لکھا۔اس میں وہ لکھتے ہیں کہ سفیان اور وکیع جیسے عظیم ناقدین حدیث بڑی محنت و کاوش کے بعد ایک ہزار حدیث میں سے صرف ایک مرفع متصل حدیث نکال سکتے

تھے۔[حجۃ اللہ البالغہ ج ا،ص ۱۴۸] اور ان کی تنقید کا معیار کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ میں ستر ایسے اشخاص سے مل چکا ہوں جنھیں اگر بیت المال سپرد کیا جائے تو وہ امین ثابت ہوتے۔مگر میں نے ان سے کوئی روایت قبول نہیں کی''۔وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ تنقید حدیث کے اصولوں سے نا آشنا تھے۔

صحابہ کرامؓ کے تحریری مجموعے:

منکرین حدیث اور پرویز صاحب کا عمومی اعتراض ہے کہ صحابہ کرام نے حدیثیں قلم بند نہیں کیں لہٰذا تمام حدیثیں مسترد کر دی جائیں اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں ہے،منکرین حدیث یہ بھی لکھتے ہیں کہ حدیثیں تین سو سال بعد مرتب ہوئیں اس الزام میں بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔احادیث کے تیسری صدی میں مرتب و مدون ہونے کی قیاس آرائی بھی غلط ہے۔

۱۔ صحیفہ صادقہ: مرتبہ عبداللہ بن عمرو بن عاص (م۹۳ھ) یہ صحیفہ ایک ہزار حدیث پر مشتمل تھا اور اب یہ مسند احمد میں بہ تمام و کمال مل سکتا ہے۔اس صحیفہ کو دیکھ کر ان کے پڑ پوتے عمرو بن شعیب حدیثیں روایت کرتے تھے اور اکابر محدثین مثلاً امام بخاریؒ، امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہؒ وغیرہم ان کی مرویات پر اعتماد کرتے تھے۔[تاریخ الحدیث والمحدثین،ص ۳۱۰]

۲۔ صحیفہ عمرؓ بن الخطاب: جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے احادیث کی جمع و تدوین کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ کی یہ کتاب ان کے خاندان سے ملی۔اس کتاب میں صدقات و زکوٰۃ کے احکامات درج تھے۔امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کی یہ کتاب پڑھی تھی۔[موطا امام مالک،ص ۱۰۹]

۳۔ صحیفہ عثمانؓ: اس صحیفہ میں بھی زکوٰۃ کے جملہ احکام درج تھے۔یہ وہی صحیفہ ہے جس کے متعلق حافظ اسلم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے اپنے بیٹے محمد بن حنیفہ کے ہاتھ ایک پرچہ بھیجا جس میں زکوٰۃ کے احکام درج تھے تو آپ نے یہ کہہ دیا کہ ہمیں اس سے معاف رکھو۔حافظ اسلم صاحب اس سے حضرت عثمانؓ کی حدیث سے بے اعتنائی ثابت کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے حضرت عثمان کی کتابت حدیث ثابت ہوتی ہے۔یہ واقعہ بخاری کتاب الجہاد میں مذکورہ ہے۔

۴۔ صحیفہ حضرت علیؓ: امام بخاری کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ کافی ضخیم تھا۔اس میں زکوٰۃ، صدقات، دیت، قصاص، حرمت مدینہ، خطبہ جمعۃ الوداع اور اسلامی دستور کے نکات درج تھے۔یہ آپ کے بیٹے محمدؒ بن حنیفہ کے پاس تھا۔پھر امام جعفرؒ کے پاس آیا۔اسی کی نقل آپ نے حارث کو لکھ کر دی تھی۔[تدوین حدیث برہان دہلی جون سن ۵۱،ص ۳۱۷]

۵۔ صحیفہ حضرت انسؓ بن مالک: وہ صحیفہ جسے آپ نے رسولؐ اللہ کو سنا کر اس کی تصویب بھی فرمائی تھی۔

۶۔ خطبہ فتح مکہ: جسے آپؐ نے ابوشاہ یمنی کی درخواست پر اپنا مفصل خطبہ قلم بند کرنے کا حکم دیا۔

۷۔ مسند ابو ہریرہؓ: اس کے نسخے عہدِ صحابہ میں لکھے گئے تھے۔ اس کی ایک نقل حضرت عمر بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان گورنر مصر [م۔۸۶ھ] کے پاس بھی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز [م۱۰۱ھ] نے کثیر بن مرہ کو لکھا تھا کہ صحابہ کرامؓ سے جو حدیثیں تمہارے پاس موجود ہیں وہ ہمیں لکھ کر بھیجے۔ مگر ابو ہریرہ کی مرویات بھیجنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ ہمارے پاس پہلے ہی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

۸۔ صحیفہ ہمام بن منبہ: ہمام بن منبہ حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد ہیں۔ جنھوں نے ۱۳۸ احادیث کا ایک صحیفہ تیار کیا تھا۔ یہ صحیفہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے۔ یہ صحیفہ تمام مسند احمد بن حنبل میں مندرج ہے۔

۹۔ صحیفہ بشیر بن نہیک: یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے بھی ایک مجموعہ احادیث مرتب کیا تھا اور حضرت ابو ہریرہؓ پر پیش کر کے اس کی تصویب کرائی تھی۔

۱۰۔ صحیفہ حضرت جابر بن عبداللہؓ: یہ مجموعہ مناسک حج اور خطبہ حجۃ الوداع پر مشتمل تھا۔ اس کو آپ کے شاگرد وہب بن منبہ (م۱۱۰) اور سلیمان بن قیس الشکری نے مرتب کیا۔

۱۱۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مرویات جوان کے شاگرد عروہ بن زبیر نے قلمبند کی تھیں۔

۱۲۔ حضرت ابن عباس کی مرویات: جنھیں سعید بن زبیر تابعی نے مرتب کیا۔ ایک دفعہ طائف کے چند لوگ حضرت ابن عباسؓ کے پاس آئے تو آپ نے اپنا جزودان نکالا اور اس میں سے چند احادیث انھیں املا کرائیں۔ [ترمذی، کتاب العلل]

۱۳۔ صحیفہ عمرو بن حزمؓ: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرائض وسنن اور صدقات پر مشتمل احکام لکھوا کر دیے۔ بعد میں انھوں نے مزید اکیس فرامین نبوی شامل کر کے ایک اچھی خاصی کتاب مرتب کر لی۔

۱۴۔ رسالہ سمرہ بن جندبؓ: یہ رسالہ روایات کے ایک بڑے ذخیرے پر مشتمل تھا جو بعد میں ان کے بیٹے کو وراثت میں ملا۔

۱۵۔ صحیفہ عبداللہ بن مسعودؓ: جس کے متعلق ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے حلفیہ بیان دیا کہ وہ ان کے باپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

۱۶۔ رسالہ سعد بن عبادہ نصاری: ان کے پاس بھی احادیث نبوی کا ایک رسالہ موجود تھا۔

یہ تھے وہ مجموعے جو صحابہ کے دور میں مرتب ہوئے اور جن میں بیشتر صحابہ کرامؓ نے خود لکھے یا لکھوائے تھے۔ اب غور فرمائیے کہ اگر منع کتابت حدیث والی حدیث کا حکم عام تھا تو کیا یہ سب صحابہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ کے نافرمان ہو گئے تھے؟

دوسری صدی ہجری کے مرتبہ مجموعہ احادیث:

۱۔ موطا امام مالک: امام مالک کا سن وفات ۱۷۰ھ لکھ کر یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ شاید دوسری صدی کے آخر میں مرتب ہوا ہوگا حالانکہ اس کی تالیف ۱۳۰ھ سے شروع سن ۱۴۱ھ تک ختم ہوگئی۔ یہی حال دوسری تصانیف کا بھی ہے۔

۲۔ جامع سفیان ثوری [۱۶۱ھ]

۳۔ جامع ابن المبارک [م ۱۸۱ھ]

۴۔ جامع امام اوزاعی [م ۱۵۷ھ]

۵۔ جامعہ ابن جریج [م ۱۵۰ھ]

۶۔ مسند امام ابوحنیفہ [م ۱۵۰ھ]

۷۔ کتاب الخراج امام ابو یوسف [م ۱۸۲ھ]

۸۔ کتاب الآثار، امام محمد بن حسن شیبانی [م ۱۸۹ھ] ان میں سے آخری تین کتب آج بھی متداول ہیں۔

۹۔ مسند ابو ہریرہؓ [م ۵۸ھ] جسے انھوں نے عہد نبوی کے بعد قلمبند کر لیا تھا۔ صحیفہ ہمام بن منبہ بھی اسی کا ایک جز ہے۔ یہ صحیفہ اور مسند ابو ہریرہؓ اب بہ تمام و کمال مسند احمد بن حنبل میں موجود ہے۔

۱۰۔ مسند احمد ابوحنیفہ کوفی [م ۱۵۰ھ] یہ مسند بہر حال ۱۵۰ھ سے پہلے لکھی جا چکی تھی اور متداول ہے۔

۱۱۔ مسند احمد شافعی [۲۰۴ھ] یہ مسند بھی دوسری صدی کے آخر میں مرتب ہوئی۔

۱۲۔ مسند البزاز، حماد بن سلمہ بن دینار بصری [م ۱۹۷ھ]

۱۳۔ مسند امام موسیٰ بن جعفر کاظم [م ۱۸۳ھ]

۱۴۔ مسند ابو سفیان وکیع بن جراح [امام شافعی کے ایک استاد کوفی [م ۱۹۷ھ]

۱۵۔ مسند امام اوزاعی۔ شام [۱۵۹ھ] جو مسند الشامیین کے نام سے مشہور ہوئیں۔

۱۶۔ یہ مسانید تو وہ ہیں جو دوسری صدی ہجری کے اختتام سے پہلے مرتب ہو چکی تھیں اور جو بعد میں مرتب

ہوئیں ان کی تعداد سو سے زائد ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ حدیث مصنفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، از ص ۴۵ تا ص ۵۶ اور نمبر شمار ۱۰ تا ۲۰۶]

۱۷۔ صحابہؓ کے پاس بھی صحیح احادیث کے بہت سے تحریری مجموعے موجود تھے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ پھر تابعین کے پاس جو تحریری مجموعے موجود تھے ان کا شمار مشکل ہے۔

۱۸۔ اسی طرح ابھی تابعین کا دور بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ۱۴۱ھ میں موطا امام مالک ہوگئی جو صحت اور جامعیت کے اعتبار سے صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہے بلکہ بعض حضرات اسے صحیح ترکتاب شمار کرتے ہیں۔

سنت وحدیث کی ضرورت: امام شافعیؒ کا استدلال

امام شافعیؒ اور ایک منکر حدیث کے درمیان ''کتاب الام'' میں مکالمے کی چند جھلکیاں درج ذیل ہیں:

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ قرآن میں میت کے ترکہ سے متعلق مختلف مقامات پر مندرجہ ذیل دو آیات ہیں:

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیة للولدین والاقربین [البقرۃ ۲/۱۸۰] ''جب تم میں سے کسی کو موت آجائے اور اس نے مال چھوڑا ہو تو تم پر والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت فرض کی گئی ہے''۔

اور دوسرے مقام پر ہے:

ولا بویه لکل وحد منهما السُدُسُ مما ترک ان کان له ولد فان لم یکن له ولد وو رثه ابواه فلامه الثلث فان کان له، اخوة فلامه السدس [النساء ۴/۱۱] والدین میں سے ہر ایک کو ۱/۶ حصہ ملے گا۔ اگر میت کی اولاد ہو اور اگر اولاد نہ ہو اور اس کے وارث اس کے والدین ہوں تو ماں کو ۱/۳ حصہ ملے گا اور اگر میت کے بھائی بھی ہوں تو اس کی ماں کو ۱/۶ حصے ملے گا۔

یہ آیات پڑھ کر امام شافعیؒ نے کہا کہ پہلی آیت کی رو سے میت کو والدین اور اقربین کے حق میں وصیت کا پورا اختیار دیا گیا ہے لیکن دوسری آیت میں اور اقربین کے حق میں اس اختیار کو کلی طور پر سلب کر کے اللہ تعالیٰ نے خود ان کے حصے مقرر کر دیے ہیں۔ اب بتایے کہ سنت سے آپ بے نیاز ہو کر کس آیت پر عمل کریں گے اور کیوں؟ سنت تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ پہلی آیت منسوخ ہے اور دوسری ناسخ۔ یعنی پہلا حکم ختم ہو چکا اب صرف دوسرا حکم باقی ہے۔ اب آپ نہ تو سنت کو حجت مانتے ہیں اور نہ ناسخ ومنسوخ کو اور ان دونوں آیات پر بیک وقت عمل کرنا محال ہے۔ پھر آپ کیا کریں گے؟ چنانچہ امام شافعیؒ کی اس دلیل کو سن کر منکر حدیث سنت کا قائل ہو گیا۔

کیا ظن دین کی بنیاد بن سکتا ہے؟ امام شافعیؒ

دوسری بات جس کے سامنے وہ منکر حدیث لاجواب ہوا یہ تھی کہ امام صاحب نے اس منکر حدیث سے پوچھا کہ ''یہ آدمی جو آپ کے پاس بیٹھا ہے کیا اس کا خون اور مال حرام ہے یا نہیں؟ منکر حدیث نے کہا ''حرام ہے'' امام شافعیؒ کہنے لگے کہ ''اگر دو شخص شہادت دیں کہ اس نے فلاح شخص کو قتل کیا اور اس کا مال لے لیا اور وہ مال اب اس کے پاس موجود ہے تو پھر اس کے بارے میں آپ کیا رویہ اختیار کریں گے؟ منکر حدیث کہنے لگا! ''میں اس کو فوراً قتل کردوں گا اور اس کا مال لے کر مقتول کے وارثوں کو دلواؤں گا''۔

امام شافعیؒ کہنے لگا کیا یہ ممکن نہیں کہ گواہوں نے غلط اور جھوٹی گواہی دی ہو؟ منکر حدیث کہنے لگا ''یہ تو ممکن ہے'' امام صاحب نے کہا پھر آپ نے اس شخص کے مال اور خون کو جھوٹی گواہی کی بناء پر کیسے مباح قرار دیا۔ حالانکہ وہ خون اور مال حرام تھا؟ منکر حدیث کہنے لگا ''اس لیے کہ شہادت کا قبول کرنا ضروری امر ہے''۔

شہادت اور روایت: امام شافعیؒ کا استدلال

امام شافعی کہنے لگے ''اگر تم گواہوں کی گواہی کو ظاہری صداقت کی بناء پر قبول کرنا ضروری سمجھتے ہو اور باطن کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے تو ہم راوی کے لیے جو شرائط عائد کرتے ہیں وہ گواہی کی شرائط سے زیادہ کڑی ہیں۔ چنانچہ ہم جن لوگوں کی شہادت کو قبول کرتے ہیں ضروری نہیں کہ ان کی روایت کردہ حدیث کو بھی صحیح سمجھ لیں۔ راوی کی صداقت کا پتہ تو رواۃ و رجال سے بھی چل سکتا ہے جو روایت حدیث میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب وسنت سے بھی راوی کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جب کہ شہادت میں ان باتوں میں کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔ [منکرین حدیث کا استدلال ہے کہ حدیث ظنی ہے اس لیے قابل قبول نہیں۔]

منکرِ حدیث کا اعتراف حقیقت:

یہ مکالمہ خاصا طویل ہے جس میں امام موصوف نے دیگر کئی مثالوں سے اسے قائل کیا اور بالآخر وہ کہنے لگا میں تسلیم کرتا ہوں کہ حدیث نبوی دین میں حجت ہے اور جس نے رسولؐ کی حدیث کو تسلیم کیا اس نے گویا اللہ کے حکم کو قبول کیا۔ آپ کے بتانے سے مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوگئی''۔ [کتاب الام، ج ۷، ص ۲۵۰]

وضاعین حدیث کا عبرت ناک انجام:

یہی عبدالملک بن مروان جس نے کہا تھا کہ مشرق کی طرف سے موضوع احادیث کا سیلاب بہہ کر ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس نے مشہور وضاع حارث بن سعید الکذاب کو اسی جرم میں تختہ دار پر کھینچا۔ کیونکہ عبدالملک اپنے آپ کو محض بادشاہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے دین کا محافظ بھی سمجھتا تھا۔ اسی عبدالملک کے بیٹے

ہشام نے غیلان دمشقی کو قتل کیا، جس کا جرم یہ تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے دین میں رخنہ اندازیاں کرتا تھا اور موضوع حدیثیں بنا کر عوام میں پھیلاتا تھا۔ چونکہ حدیث دین میں اہم مقام کی حامل تھی لہٰذا اس کے وضاعین دین کی بنیادوں کو منہدم کر رہے تھے۔

ابوجعفر منصور عباسی [۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ] نے اسی وضع حدیث کے جرم میں محمد بن سعید مصلوب کو سولی دی۔ مہدی، رشید مامون وغیرہ عباسی خلفاء کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب میں سب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں کہ پیغمبرؐ کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہو کر پھیل نہ جائے اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عدالتوں میں شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان وضعی احادیث کی بناء پر اگر انسانوں کے حقوق تہہ و بالا ہوتے نظر آ رہے ہوں اور وہ خاموشی سے برداشت کر لیے جائیں بلکہ تاریخ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کے ولاۃ اور حکام بھی اس مسئلہ میں کسی رورعایت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ بنی امیہ کے مشہور گورنر خالد بن عبداللہ القسری نے ایک شخص کو اسی وضع حدیث کے جرم میں قتل کیا تھا۔ اسی طرح عباسیوں کی طرف سے بصرہ میں، محمد بن سلیمان جب حاکم تھا، تو اس نے مشہور وضاع عبدالکریم بن ابی العوجاء کو اسی وضع حدیث کے جرم میں قتل کیا اور عدالتوں کے قاضی تو اس معاملہ میں اور بھی زیادہ چوکنے رہتے تھے۔ اگر انھیں ذرا بھی شک پڑ جاتا کہ فلاں شخص حدیث صحیح نہیں بیان کر رہا تو اس کی خوب خبر لیتے تھے۔ قاضی اسماعیل بن اسحاق نے ہیثم بن سہل کو محض اس وجہ سے دُرے لگوائے کہ ایسی روایات بیان کرنے لگا تھا جنھیں قاضی اسماعیل صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

حدیثوں کی تعداد: منکرین حدیث کا اعتراض

احادیث کو مشکوک ثابت کرنے کے لیے حدیثوں کی تعداد کو جس انداز میں پیش کیا جاتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔ مقام حدیث کے ص ۲۵ پر زیر عنوان ''کتنی حدیثوں کو رد کر دیا'' لکھتے ہیں۔ ضمناً یہ بھی دیکھیے کہ ان حضرات کو کس قدر احادیث ملیں اور ان میں سے انھوں نے کتنی احادیث کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں داخل کیا۔

[۱] امام بخاری چھ لاکھ میں سے مکررات نکال کر صرف ۷۲۶۲۔ [۲] امام مسلم تین لاکھ میں سے صرف ۴۲۴۸۔ [۳] ابوداؤد پانچ لاکھ میں سے ۴۸۰۰۔ [۴] ابن ماجہ چار لاکھ سے صرف ۴۰۰۰۔ [۵] نسائی دو لاکھ میں سے صرف ۴۳۲۱

امام بخاریؒ کے بارے میں طلوع اسلام کا مؤقف ہے:

''انھوں نے شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر چھ لاکھ کے قریب احادیث جمع کیں ان میں سے انھوں نے اپنے معیار کے مطابق صرف ۷۲۰۰ احادیث کو صحیح پایا اور انھیں اپنی کتاب میں درج کر لیا باقی پانچ لاکھ ترانوے ہزار کو مسترد کر دیا''۔ [م۔ح، ص ۲۲] یہ استدلال بھی علم حدیث سے ناواقفیت یا دروغ گوئی پر مشتمل ہے۔ اس

استدلال سے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

''ذرا سوچیے کہ اگر امام بخاری پانچ لاکھ چورانوے ہزار احادیث کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ وہ ان کی دانست میں رسولؐ اللہ کی نہیں ہوسکتیں اور اس سے وہ منکر حدیث نہیں قرار پاتے تو اگر آج کوئی شخص ایک حدیث کے متعلق کہتا ہے کہ اس کی بصیرت قرآن کی رو سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہوسکتی تو وہ کافر اور خارج از اسلام کس طرح قرار پاسکتا ہے؟ وہ درحقیقت ایک جامع حدیث کے شاہد یا راوی کی روایت کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے۔ ارشاد نبوی سے انکار نہیں کرتا''۔ [م ح، ص ۵۶]

مندرجہ بالا اقتباسات سے درج ذیل امور قابل غور ہیں:

اقتباس نمبر ا میں مندرجہ تختہ کے پہلے کالم سے احادیث کی تعداد ۲۲ لاکھ سے متجاوز ہے جب کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد جو روایات میں مذکور ہے وہ چودہ لاکھ ہے، جس میں صرف مندرجہ بالا محدثین ہی شامل نہیں بلکہ دوسرے محدثین بھی شامل ہیں اور اس کثرت تعداد کے پانچ اسباب ہیں جو علم حدیث سے واقف علماء بخوبی جانتے ہیں۔ گویا یہ تعداد مختلف طرق اسانید کی ہے نہ کہ متون سنن و آثار کی۔ چونکہ محدثین ہر طریقہ سند کو الگ حدیث شمار کرتے ہیں لہٰذا یہ تعداد انھیں کے شمار کے مطابق ہے۔ متون کے شمار کے مطابق نہیں۔ اس طرح منکرین حدیث عوام کو مغالطے میں مبتلا کرتے ہیں۔

احادیث کی اصل تعداد:

جسے عرف عام میں حدیث کہا جاتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار سے متجاوز نہیں پھر بے شمار ایسی حادیث ہیں جو مندرجہ بالا مختلف مجموعوں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی اصل تعداد نصف سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ چنانچہ حاکم کی تحقیق کے مطابق صحاح ستہ کے علاوہ مسند احمد بن حنبل سمیت صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

الاحدیث التی فی الدرجة الاولی لا تبلیغ عشرة الاف [توجیہ النظر بحوالہ تدوین]

''اعلیٰ درجہ کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہنچ پاتی''۔

مستند احادیث:

حفاظت قرآن کا دوسرا جیتا جاگتا ثبوت مستند احادیث کا وجود ہے جسے طلوع اسلام ناقابل اور ظنی چیز سمجھتا ہے اور محض تاریخ کے مقام پر لے آتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس ظنی اور ناقابل اعتماد چیز کو کسی وقت حفاظت قرآن بلکہ حفظ جیسے اہم مسئلے میں پیش کر دیتا ہے۔ مثلاً ''اور تاریخ سے ہمیں اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ رسولؐ اللہ حفاظ سے بار بار قرآن کو سنا کرتے تھے اور خود بھی ان کو سناتے تھے۔ اس مقصد کے لیے مکہ میں

حضرت ارقم مخزومی کا مکان متعین تھا اور مدینہ میں مسجد نبوی میں صفہ عام طور پر حفاظ کا مرکز تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے وقت سینکڑوں حفاظ موجود تھے اور ان میں سے متعدد ایسے تھے جن کو سند خود رسولؐ اللہ نے عطا فرمائی تھی''۔[قرآنی فیصلے،ص۲۱۷] مسائل کے جواب میں پرویز صاحب کا استدلال کہ قرآن جیسی یقینی چیز کے لیے حدیث جیسی ظنی چیز سے کر رہے ہیں

پرویز صاحب: مذہب سے دین تک کا سفر:

۱۔ ''سائنس فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے اور مذہب یہ سکھاتا ہے کہ ان قوتوں کے ماحصل کو صرف کس طرح کرنا چاہیے.....لہٰذا مذہب سائنس کی کاوشوں کی قدر کرے گا''۔[انسان نے کیا سوچا؟، ص۲۲۶]

۲۔ اس کا جواب اپنے مقام پر آئے گا جہاں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں عالمگیر مذہب یعنی دین ہونے کی اہلیت کس میں ہے''۔[م۔۲:۲۰۷]

۳۔ ''چنانچہ ان مذاہب میں جن میں توہم پرستی نے حقائق کی جگہ لے رکھی ہے اور اسلام کے علاوہ اور کونسا مذہب ہے جس میں ایسا نہیں ہوا''اس عقدہ کے حل میں عجیب وغریب افسانہ طرازیوں سے کام لیا ہے''۔[م۔۱۶]

۴۔ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھیے کہ مذہب کا یہ نظام [یعنی عالمگیر صداقتوں پر متشکل عملی اسلوب] جسم نامی کی طرح بڑھتا رہا ہے''۔[م۔۲:۲۴۶]

۵۔ مسلمان یہ آزادی ہر ایک کو دیں گے۔لیکن ان کے نزدیک مذہبی آزادی یہیں تک محدود نہیں۔ یہ تو ان کے مذہب کا ایک گوشہ ہے ان کے مذہب کا دائرہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں محیط ہے۔ اس لیے ان کے ایمان کے مطابق مذہبی آزادی سے مفہوم نظام مملکت کی آزادی ہے۔ یہی ان کا دین ہے''۔[م۔۴:۲۴۶]

۶۔ یہ سامی نسل ہی ہے جسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے نوع انسانی کا مذہب مرتب کیا۔تاریخی حدود سے کہیں آگے۔ دنیاوی خباثتوں اور آلودگیوں سے پاک اور صاف اپنے خیموں میں بیٹھے ان بدوی مصلحین نے نسل انسانی کے لیے مذہب کی تدوین کی''۔[م۔۲:۳۳۸]

۷۔ ''ہم نے بتایا ہے کہ مذہب سے انسانی سیرت میں بلندی اور پختگی پیدا ہوتی ہے''۔[م۲۔۲۷۵]

۸۔ ''یورپ کے ارباب فکر ونظر قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدت افکار [ایمان و مذہب] پر ہی رکھی جانی چاہیے نہ کہ جغرافیائی حدود اور

رنگ ونسل پر''۔[م۲:۳۶۷]

دوسرا دور لفظ مذہب سے بیزاری کا اظہار:

پر جب آپ نے ۱۹۵۲ء میں اسباب زوال امت تالیف کی تو مذہب اور دین کے مفہوم کو بالکل جدا جدا بیان فرمایا اور ان کو مختلف بلکہ متضاد اشیاء کے طور پر پیش فرمایا۔ چنانچہ اس کتاب کے ص ۵۵ پر تحریر فرمایا: '' آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں مذہب اور دین کے الفاظ الگ الگ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن مذہب نہیں لایا تھا۔ حتیٰ کہ مذہب کا لفظ بھی غیر قرآنی ہے، سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔ وہ دین لایا تھا۔ مذہب اس وقت پیدا ہوا جب نظام دین مفقود ہو گیا۔ آج ہمارے پاس مذہب ہے دین نہیں۔ لہٰذا میری تحریروں میں جہاں مذہب کا لفظ آئے اس سے یہی مفہوم ہوگا میں اسلام کو دین کہہ کر پکارتا ہوں [کہ قرآن نے اسے دین کہا ہے] اسے مذہب نہیں کہتا۔

۱۔ مذہب یا دھرم سے مفہوم ہے خدا اور بندے کے درمیان تعلق، پرائیویٹ عقیدہ[م۴۔۴۱۷]	۱۔قرآن کا لایا ہوا دین[عملی نظام]مذہب اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا'' [زوال امت ص۸۹] گویا دین بمعنی عملی نظام اور
۲۔ مذہب = دین۔ نظام مملکت[م۴۔۴۲۰]	۲۔دین = مذہب+ملوکیت[حوالہ ایضاً]
۳۔ مذہب ضابطہ اخلاق پیش کرتا ہے[زوال ۸۸]	۳۔ دین نظام خلق[متوازن نظام] پیش کرتا ہے۔ [زوال ص۸۸ گویا دین = نظام خلق = توازن نظام]
۴۔ مذہب = رہبانیت[م۴۔۴۲۰]	۴۔دین = مذہب + سیاست[م۴۔۴۳۱]
۵۔قانون بلاقوت[م۴۔۴۳۴]	۵۔دین = آخرت + دنیا[زوال ص۹۱]
۶۔ مذہب = دین۔قوت[م۴۔۴۳۶]	۶۔دین = مذہب + نظام حکومت[زوال ص۹۳]
۷۔ مذہب = دین۔ دنیا[م۴۔۴۸۶]	۷۔دین = مذہب + نظام مملکت[م۴:۴۲۰]

پرویز صاحب کی مغرب و اشتراکیت کی جامع فکر نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ امت کے لیے گمراہی کے دروازے کھولتی ہے۔ یہ گمراہی مغرب اور اشتراکیت کی زبردست حلیف ہے لیکن اپنے آپ کو قرآن کے لباس میں پیش کرتی ہے۔

پرویز صاحب کی فکر کی اساس ہی غلط ہے اور جب اساس ہی غلط ہو تو پھر نتائج کے معاملے میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ تا ثریا می رود دیوار کج۔

پرویز صاحب کے اصولِ فہمِ قرآن: زبان

وہ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ وہ قرآن ہی سے سب کچھ لیتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں قرآن ہی کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید کے فہم کے لیے یا قرآن مجید تک رسائی کے لیے انھوں نے جو اصول قائم کیے ہیں وہ اصول کیا صحیح ہیں؟

قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے پرویز صاحب نے جو اصول اپنائے ہیں ان میں سب سے اہم اور بنیادی چیز، زبان کے بارے میں ان کا تصور ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ قرآن مجید زبان کے لبادے میں ہے۔

قرآن مجید کے فہم کے لیے اس کی زبان سے اعلیٰ سطح کی واقفیت ضروری ہے۔

لفظوں کی تحقیق: مادہ

اب ظاہر ہے کہ زبان میں مسلسل ارتقا سے یہ چیز پیدا ہوگئی ہے کہ آج جو لفظ بھی ہم بولتے ہیں اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔یعنی اگر آپ کسی لفظ کی تاریخ کا تتبع کریں، اس کے پیچھے پیچھے چلیں اور یہ جانیں کہ یہ کیسے بنا ہے تو ممکن ہے کہ آپ اس لفظ کی اصل تک پہنچ جائیں کہ یہ لفظ حقیقت میں کیا تھا؟ ارتقا کے کن مراحل سے گزرا؟ ابتداء میں کس مفہوم کا حامل تھا؟ بعد میں اس کے معنی میں کیا تبدیلی آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو زبان کے ماہرین زیر بحث لاتے ہیں اور اس طرح لغوی تحقیق کا علم وجود میں آتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض اوقات ایسی تحقیق کسی نتیجے تک نہ پہنچے لیکن بالعموم اس طریقہ تحقیق سے ہم اس لفظ کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو دنیا کی ہر زبان میں ہوتی ہے۔عربی زبان کا معاملہ یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے اختلاط سے نہیں بنی۔اس لیے اس میں یہ تحقیق اور بھی آسان ہو جاتی ہے۔اور اس میں ہم بہت آسانی کے ساتھ یہ بتا دیتے ہیں کہ یہ ایک مادہ ہے جس سے مختلف الفاظ مختلف مراحل میں بنتے چلے گئے۔

علم لسانیات اور متکلم کا کلام:

اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے آدمی یہ جان لیتا ہے کہ ہم جس لفظ کو آج بول رہے ہیں یہ لفظ اپنا کیا پس منظر رکھتا ہے، اس میں یہ معانی کیسے پیدا ہوئے ہیں؟ لیکن اس ساری بحث میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کا تعلق علم لسانیات سے ہے، زبان کے فہم یا کسی کے کلام پر تدبر سے نہیں، یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ کسی کلام کا متکلم جب اپنا مدعا بیان کرتا ہے تو اس میں کوئی چیز یہ اہمیت نہیں رکھتی کہ جو لفظ اس نے استعمال کیا ہے، اس لفظ کی تاریخ کیا ہے؟ اس میں جو چیز بہت اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ اس نے یہ لفظ جب استعمال کیا اس وقت یہ کس معنی میں بولا جاتا تھا؟ جو محاورہ استعمال کیا گیا اس زمانے میں اس کا کیا مفہوم تھا؟ یہ چیز بالکل بدیہی ہے۔تفہیم کلام کے لیے ہم اردو زبان سے چند مثالیں پیش کر رہے ہیں جو اصول یہاں پیش نظر ہے، ظاہر ہے، ان کا اطلاق دیگر زبانوں پر بھی ہوگا۔

شوربے کی لغوی، تاریخ اور آجکل مفہوم:

۱۔ ہم اردو زبان میں ایک لفظ کثرت سے بولتے ہیں ''شوربا''۔ آج بھی ہم یہ لفظ بولتے ہیں اور آج سے پہلے بھی یہ لفظ بولا جاتا رہا ہے۔ آج اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے شوربے کے ساتھ روٹی کھائی ہے تو اس کا ایک مفہوم جو اس زمانے میں جب ہم یہ لفظ بول رہے ہیں، ہر ایک بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ہم یہ جملہ زبان سے ادا کرتے ہیں تو ہمارا مخاطب فوراً اس کا مفہوم سمجھ لیتا ہے۔ اس مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد وہ ہمارے مدعا کو پالیتا ہے۔ اس میں اس کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ یعنی وہ ''میں نے شوربے سے روٹی کھائی ہے''۔ کا جملہ سن کر نہ تو ''میں'' کی لسانی تاریخ سے بحث کرتا ہے نہ ''نے'' کی تحقیق کرتا ہے نہ تو اسے ''روٹی'' کا لسانی پس منظر جاننے کی ضرورت پڑتی ہے اور ہی اسے ''کھائی ہے'' کی لغوی تاریخ سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اگر اردو زبان سے واقف ہے تو ہم جیسے ہی یہ جملہ بولتے ہیں وہ اپنے متعارف علم کی بنیاد پر ہمارا مفہوم سمجھ لیتا ہے۔ یہی بات زبان میں اصل اہمیت رکھتی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ علم و دانش کی کسی مجلس میں کوئی لسانیات کا ماہر ہے۔ اس سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ ''شوربا'' کیسے بنا۔ تو وہ مثال کے طور پر کہتا ہے کہ اصل میں یہ لفظ قدیم دری زبان سے ہوتا ہوا آیا ہے۔ ''شور'' نمک کو کہتے ہیں۔ اب بھی فارسی میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے، اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سمندر کو اسی وجہ سے دریائے شور کہا جاتا ہے اور ''با'' پانی کو کہتے ہیں۔ تو یہ لفظ نمکین پانی کے لیے مستعمل تھا۔ رفتہ رفتہ ایک خاص طرح کے سالن کے لیے استعمال ہونے لگا۔

پرویز صاحب کی لفظی تحقیق: شوربے کی تحقیق ہے

ایک ماہر لسانیات کی اس تحقیق سے ہمیں روشنی ملی کہ یہ لفظ کیسے بنا، اس کا پس منظر کیا ہے، لیکن وہ مفہوم جو متکلم نے یہ جملہ بول کر ''میں نے شوربے سے روٹی کھائی ہے'' ادا کرنا چاہا تھا، اس نے نہ اس تحقیق میں اضافہ کیا اور نہ ردوبدل کیا۔ وہ مفہوم اپنی جگہ ہے۔ اب دیکھیے کہ یہ بحث اگر لسانیات کے دائرے میں رہے تو اس میں ایک حسن بھی ہے، اس کی داد بھی دی جاسکتی ہے، اس سے لطف بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ جملہ اگر ایک مصنف نے اپنی کتاب میں لکھ دیا کہ میں نے شوربے سے روٹی کھائی۔ یعنی کوئی مضمون بیان کرتے ہوئے یا کوئی روداد لکھتے ہوئے یہ جملہ لکھ دیا۔ اب کتاب پر دو چار پانچ دس صدیاں گزر گئیں۔ اب اس کے بعد ایک آدمی نے اس کتاب کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا۔ شرح لکھتے وقت فطری اصول یہ ہوگا کہ شارح یہ دیکھے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی اس وقت شوربا کسی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ وہ اگر اس زمانے کی تحقیق کرے گا اور اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ خاص طرح کے سالن کا شوربا کہا جاتا

تھا تو وہ مصنف کا مفہوم صحیح سمجھ لے گا۔لیکن اس کے برخلاف اگر اس نے کہیں سے لسانیات کی کوئی کتاب اٹھالی اور شوربے کی تاریخ پر تحقیق کرنا شروع کر دی اور تحقیق کرنے کے بعد اس نے یہ معلومات حاصل کر لیں کہ ''شور'' اصل میں نمک کو کہتے ہیں اور ''با'' اصل میں پانی کو کہتے ہیں اور پھر اس جملے کا یہ مطلب بیان کر دیا کہ مصنف نے نمکین پانی سے روٹی کھائی ہے تو اصل میں اس نے نہ صرف علم پر ظلم کیا، نہ صرف زبان پر ظلم کیا بلکہ مصنف پر بھی ظلم کیا۔ وہ یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا مدعا ہی نہیں تھا۔اس نے نمکین پانی سے ہرگز روٹی نہیں کھائی بلکہ ایک خاص طرح کے سالن سے روٹی کھائی۔ شارح نے چونکہ لفظ کے استعمال اور رائج مفہوم کو نظر انداز کیا، اس لیے وہ مصنف کی بات کو صحیح طور پر بیان کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔

متکلم کی بات لغت کی تحقیق سے واضح نہیں ہوگی:

۲۔ ایک لفظ ہے ''ٹیلی ویژن''۔ فرض کر لیجیے کہ ایک شخص کہتا ہے ''میں نے ایک ٹیلی ویژن خریدا'' اس زمانے کا ہر آدمی جانتا ہے کہ ''ٹیلی ویژن'' کیا ہے۔ایک خاص آلہ ہے، زبان سے یہ لفظ ادا کرتے ہی اس کا ایک تصور ذہن میں آتا ہے لیکن اگر کوئی اس جملے ''میں نے ایک ٹیلی ویژن خریدا'' کی لسانی تحقیق شروع کر دے اور یہ کہے کہ لغت کے مطابق ٹیلی کا مطلب ہے انتقال اور ویژن کے معنی ہیں منظر، اس لیے اس شخص نے ایک ''انتقالِ منظر'' خریدا، تو لسانیات کی یہ تحقیق صحیح ہونے کے باوجود ایک لغو بات ہے اور کلام کی غلط تفہیم ہے۔ اب ٹیلی ویژن کو ٹیلی ویژن کا نام کیوں دیا گیا؟ اس کے لیے لسانیات کی تحقیق کیجیے۔ ''شوربا'' کا لفظ کیسے وجود میں آیا ہے اور اس سالن کو شوربا کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے لسانیات کی تحقیق کیجیے، لیکن کسی متکلم کی بات کا مفہوم جاننے کے لیے اس تحقیق کی پرکاہ کے برابر اہمیت نہیں۔ جو آدمی اس طرح کی حرکت کرے گا، اس کے بارے میں دو ہی باتیں کہی جاسکتی ہیں یا تو یہ کہ اس بے چارے کو زبان سے، ادب سے، اسالیب کلام سے کوئی واقفیت نہیں ہے، وہ اس معاملے میں قطعاً لاعلم ہے اور یا یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی بات متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہ رہا ہے۔ان دونوں میں سے کوئی ایک بات لازماً کہنی پڑے گی۔

زبان میں تشبیہ واستعارہ کی اہمیت:

زبان ہی سے متعلق ایک اور بات جان لیجیے کہ ہر زبان میں تشبیہ بھی ہوتی ہے، استعارہ بھی ہوتا ہے، تمثیل بھی ہوتی ہے۔مثال کے طور پر ایک شخص کہتا ہے ''جب سے میں نے دوپہر کا کھانا کھایا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سینے میں آگ لگی ہوئی ہے''۔اس جملے کو سننے کے بعد اردو زبان سے واقف کوئی عامی بھی یہ نہیں کہے گا کہ متکلم سینے میں کسی نے دو چار لکڑیاں گھسا دی ہیں اور ان کو آگ لگی ہوئی ہے۔ ہر آدمی یہ

جانتا ہے کہ آگ کا لفظ یہاں مجازاً بولا گیا ہے۔یعنی اس سے مراد وہ آگ نہیں ہے جو چولہے میں جلتی ہے۔ اب اس جملے پر غور کیجیے''خاتون نے چولہے میں آگ جلائی،غلطی سے ساتھ رکھے ہوئے کپڑے نے آگ پکڑ لی اور تھوڑی دیر میں پورا گھر آگ کی لپیٹ میں تھا''۔ان جملوں میں جو لفظ''آگ''استعمال ہوا ہے اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ اس سے مراد سینے کی آگ ہے،تو ظاہری بات ہے کہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے۔یعنی ہم یہ تو مانتے ہیں کہ آگ کا ایک حقیقی مفہوم ہے اور آگ کا ایک مجازی مفہوم بھی ہے۔لیکن یہ بات کہ یہ لفظ ایک جملے میں حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی،اس کا تعین جملے کا اسلوب کرے گا۔

سینے کی آگ اور چولہے کی آگ کا فرق:

یعنی ہر آدمی جانتا ہے کہ کہاں سینے کی آگ لگی ہوئی ہے اور کہاں چولہے کی آگ لگی ہوئی ہے۔ جب ہم یہ مصرع پڑھتے ہیں''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''تو ہم جانتے ہیں کہ یہاں کون سی آگ مراد ہے جو برابر دونوں طرف لگی ہوئی ہے۔کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ صاحب تو غالباً اپنی موم بتی کو دونوں طرف سے جلا کر بیٹھ گئے ہیں۔ہر آدمی جانتا ہے کہ یہاں دونوں طرف کون سی آگ برابر لگی ہوئی ہے۔لیکن اگر کوئی آدمی اس طرح کے سیاق میں آگ کا لفظ استعمال کرتا ہے جس میں سینے کی آگ کے معنی میں لینے کے لیے کوئی قرینہ ہی موجود نہیں ہے تو دو ہی باتیں ہوں گی۔یا تو وہ اس زبان کے اسالیب سے جاہلِ محض ہے یا وہ کوئی خاص مقصد ہے جس کے تحت وہ سینے کی آگ کو چولہے کی آگ بنانا چاہتا ہے،اور چولہے کی آگ کو سینے کی آگ بنانا چاہتا ہے۔

تشبیہہ کا استعمال اور محل:

ایک اور مثال لیجیے۔ایک شخص ایک استاد سے کہتا ہے''آپ کے فلاں شاگرد نے تو کمال کر دیا۔ایسے حسن وخوبی سے بات کی،ایسی شان ووقار سے بات کی کہ بس مخاطب کے چھکے چھڑا دیے۔ہم نے کہا کہ تم تو شیر آدمی ہو''۔ان جملوں سے کسی مخاطب کو بھی یہ شبہ نہیں ہوگا کہ اس شیر سے مراد وہ شیر ہے جس کو اس کے بچے چڑیا گھر میں دیکھ کر آئے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں کہ یہاں شیر کا کیا مفہوم ہے۔لیکن فرض کیجیے اگر کوئی یہ کہے صبح سے بچے ضد کر رہے تھے کہ ہم تو چڑیا گھر جا کر شیر دیکھیں گے اور آپ یہ کہیں''وہ چڑیا گھر ایک بہادر آدمی کو دیکھنے لگے تھے''۔ظاہر ہے زبان سے واجبی سا تعلق رکھنے والا شخص اس سخن فہمی کا ماتم کرے گا۔

تمثیل کا استعمال اور محل:

تمثیل کا معاملہ بھی یہی ہے۔ہم کسی چیز کو جب مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں تو اس میں ایسے ایسے جملے لے آتے ہیں جس سے ہمارا مخاطب یہ جان لیتا ہے کہ یہ بات ہم مثال کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔حضرت مسیح علیہ السلام ایک بہت اعلیٰ درجے کے خطیب ہیں۔وہ بالعموم تمثیل کے اسلوب میں کلام

کرتے ہیں۔انجیل ان کے ایسے خطبوں سے بھری پڑی ہے، جس میں وہ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک موقع پر انھوں نے ارشاد فرمایا:

> تم کو میں کیا کہوں، تم جس کے انتظار میں ہو، تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم گیارہ کنواریاں ہو۔تیل کی کپیاں بھر کے بیٹھی ہو۔تمہیں نہیں معلوم کہ دولہے نے کس وقت آنا ہے۔تم انتظار کر رہی ہو کہ دیا جلاتی رہو گی۔لیکن جب دولہے کے آنے کا وقت ہوا تو تم سو گئیں۔

یہ تمثیل ہے۔اس کلام میں ہر آدمی جانتا ہے کہ ایسے قرائن موجود ہیں جو واضح کر رہے ہیں کہ یہ نہیں کہ واقعی حضرت مسیح علیہ السلام کی قوم میں گیارہ دلہنیں تھیں اور وہ تیل کی کپیاں لیے بیٹھی تھیں۔اسی طرح ایک موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام اپنی قوم کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

> تم زمین کا نمک ہو۔اگر یہ نمک ہی اپنی نمکینی سے محروم ہو گیا تو پھر کیا باقی رہ جائے گا۔

یہ معلوم ہے کہ یہاں زمین کا نمک کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔اس سے مراد کوہستان نمک کا نمک نہیں ہے۔اس تمثیل کو سنتے ہی آدمی جان لیتا ہے کہ مدعا کیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام فریسیوں اور فقیہوں سے خطاب کر کے کہتے ہیں:

> بدبختو! تم نے میرے شاگردوں پر اعتراض کیا کہ انھوں نے ہاتھ دھو کر کھانا نہیں کیا۔تم تو وہ ہو کہ مچھروں کو چھانتے ہو اور اونٹوں کو نگلتے ہو۔

اونٹ کو نگلنا مجاز کا اسلوب ہے حقیقت نہیں:

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہاں اونٹ کو نگلنے سے کیا مراد ہے۔یعنی وہ اونٹ جو صحرائے عرب میں پایا جاتا ہے، اس کو سموچا نگل لینا مراد نہیں۔یہاں مجاز کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ایک بڑی عمدہ تمثیل میں انھوں نے اپنا مدعا بیان کیا ہے۔یہاں الفاظ اور اسالیب اپنا مفہوم خود بتا رہے ہیں۔اس کے لیے تشریح کی ضرورت نہیں۔لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقع پر اپنی امت کی طرف سے دو اونٹ ذبح کیے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل میں بعض بڑی بڑی حقیقتیں ذبح کر دیں اور ذبح کرنے سے مراد یہ تھا کہ انھوں نے اس سب حقیقتوں کو لیا جو اس وقت عرب کی جاہلیت میں پائی جاتی تھیں اور اپنے پاؤں کے نیچے رکھ دیا تو ظاہر ہے کہ اس سیاق میں اس سباق میں اس مفہوم کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ الفاظ کسی کلام میں حقیقی یا مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں تو یہ جملوں کا دور و بست ہے، جو یہ تعین کرتا ہے کہ کہاں کون سا لفظ حقیقی مفہوم میں ہے اور کہاں مجازی۔

قرآن کے الفاظ کی تحقیق: دین سے کیا تعلق ہے؟

قرآن مجید بھی ظاہر ہے کہ ایک زبان میں نازل ہوا ہے پھر وہ ایک مربوط کلام ہے۔اس کی

تفہیم میں بھی یہ تمام امور پیش نظر رہیں گے۔ یعنی اس میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ہم ان کے مادوں کی تحقیق بھی کر سکتے ہیں کہ وہ مختلف ادوار میں ترقی کرتے ہوئے اس مفہوم تک کیسے پہنچے ہیں۔ لیکن یہ تحقیق اگر اس مقصد کے لیے کی جائے کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ لفظ میں معنی کیسے پیدا ہوئے؟ یہ تو لسانیات کی بڑی اعلیٰ بحث ہوئی اور اگر یہ تحقیق اس مقصد کے لیے کی جائے کہ لفظ کا وہ مفہوم جس میں وہ آج استعمال ہوتا ہے یا اس وقت استعمال ہوتا تھا، اس کو تبدیل کر کے ایک نیا مفہوم اس میں شامل کر دیا جائے تو اس کا وہی نتیجہ نکلے گا جو ہم مثالوں سے واضح کر چکے ہیں۔ یعنی قرآن کی آیات کا صحیح مفہوم ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

''لفظ'' کے معنی پھینکی ہوئی چیز:

ہم اس بحث کو عربی کی ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ ''لفظ'' عربی زبان کا مصدر ہے۔ مصدر عربی قاعدے کے مطابق اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ لفظ کے معنی میں عربی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں میں اس کے معنی ایک ہیں۔ لیکن اس کے مادے کی تحقیق کی جائے تو اس کا مطلب ہے پھینکی ہوئی چیز''۔ کسی چیز کو اگر پھینک دیں تو کہیں گے ''لفظ''۔ اب فرض کیجیے کہ اگر کوئی آدمی یہ کہے ''میں نے ایک لفظ بولا'' اور آپ یہ کہیں کہ اس نے ایک پھینکی ہوئی چیز بولی، تو اس تحقیق کی کوئی کیا داد دے گا؟ وہ یہی کہے گا کہ آپ زبان سے بالکل واقف نہیں ہیں، آپ کو کسی طرح یہ بات معلوم ہوگئی کہ لفظ کا کوئی مادہ بھی ہوتا ہے اور اس ادھورے علم کے ساتھ آپ نے اسالیب کلام پر اس کا اطلاق شروع کر دیا اور پھر وہ مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوگئی جس کا ذکر ''لفظ'' کے استعمال کے ضمن میں ہوا ہے۔ عربی زبان میں ایک دو حضرات نے لغت اس اصول پر ترتیب دی ہے۔ ان میں ایک تو امام راغب ہیں، جن کی مشہور لغت قرآن مجید کے مفردات پر ہے اور دوسرے ایک اور صاحب ہیں جنھوں نے ''مقاییس اللغۃ'' لکھی ہے۔ ان دونوں نے لسانیات کے پہلو سے اپنے لغات میں بتایا ہے کہ کوئی لفظ حقیقت میں کیا تھا۔ اب فرض کیجیے کہ یہ چیز کسی آدمی کے سامنے آ گئی اس نے سوچا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اب ایک راز میرے ہاتھ لگ گیا ہے، تو اب میں اس کے ذریعے تشبیہوں کو، استعاروں کو، مطالب کو، مفاہیم کو ہر چیز کو بدل ڈالوں گا۔ یہ حرکت جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایسا شخص کر سکتا ہے جو زبان سے اور اس کے قواعد اور اسالیب سے بالکل ناواقف ہو اور یا اس صورت میں کر سکتا ہے کہ وہ جانتے بوجھتے ایک بات کو نہیں ماننا چاہتا اور ایک دوسری بات متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہتا ہے، اور اب اس نے زبان کو اس پہلو کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

پرویز صاحب کی اصل غلطی: لفظوں کی لغوی تحقیق

قرآن مجید کے ساتھ پرویز صاحب نے دراصل وہی سلوک کیا ہے جس کو ہم نے گزشتہ صفحات میں بعض مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے قرآن کی زبان کو اس کے استعمال، عرف،

ہر چیز سے جدا کر کے لغت سے سمجھنے کی کوشش کی۔یعنی قرآن مجید کے اس عرف کو جو معاشرے نے پیدا کیا، وہ عرف جو سیاق وسباق نے پیدا کیا، وہ عرف جو متکلم نے پیدا کیا اسے ملحوظ رکھے بغیر اس کے الفاظ کو وہ معانی پہنائے جیسے کوئی علامہ اقبال کے کلام میں خودی کا وہ مفہوم داخل کر دے جو لغت میں لکھا ہوا تھا۔اسی طرح سے ایک مقام پر کوئی قرینہ موجود نہیں کہ لفظ کو مجازی مفہوم میں لیا جائے لیکن وہ اس کا مجازی مفہوم ہی لینے پر مصر ہیں۔مثلاً جملہ یہ کہ میری بیوی چولہے میں آگ جلا کر چائے بنا رہی ہے اور وہ اس بات پر مصر ہیں کہ یہاں آگ سے مراد حسد کی آگ ہے ایک مقام پر تشبیہ اور استعارے کا کوئی امکان نہیں ہے۔زبان ابا کرتی ہے کہ وہاں حقیقی مطلب کے علاوہ کوئی اور مفہوم مانا جائے لیکن وہ اس کو تشبیہ اور استعارے کے مفہوم میں لے رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن کا ترجمہ پرویز صاحب کی لغوی تحقیق کے مطابق:

اب اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو بات متکلم کہنا چاہتا ہے وہ کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔اس کے لیے وہ وہی طریقے استعمال کرتے ہیں جو اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں۔یعنی جہاں لفظ کے ایک مفہوم کو وہ قبول کرنا نہیں چاہتے، یا یہ کہیے کہ ان کو غلطی لگی ہے، دونوں ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، تو ایسے موقع پر وہ مادے کی تحقیق پیش کریں گے، اس مادے کی تحقیق سے وہ اس لفظ میں ایک نیا مفہوم پیدا کریں گے، جس سے ضروری نہیں کہ اہل عرب بھی واقف ہوں۔لیکن وہ نیا مفہوم پیدا کر کے آیت کی تاویل کر دیں گے۔جیسے ہم نے گزشتہ سطور میں بیان کیا کہ وہ مادے کی تحقیق کریں گے اور یہ جملہ کہ میں نے ایک ٹیلی ویژن خریدا کا مطلب بیان کر دیں گے کہ میں نے ایک ''انتقال منظر'' خریدا۔وہ عرف کو نظر انداز کر دیں گے اور تمثیل اور تشبیہ وہاں پیدا کر دیں گے جہاں ان کا کوئی قرینہ ہی نہیں ہے۔

لغوی تحقیق کا خمیرہ: فاش فاحش غلطیاں

ہمارے پیش نظر ان کی تصانیف ''مفہوم القرآن'' اور ''لغات القرآن'' ہیں۔''مفہوم القرآن'' میں انھوں نے اپنی تحقیق کے مطابق قرآن مجید کا مفہوم بیان کیا ہے اور ''لغات القرآن'' میں انھوں نے اپنے بیان کردہ مفہوم کا پس منظر اور اس کا علمی استدلال واضح کیا ہے۔ان دونوں کتابوں میں پرویز صاحب نے الفاظ کی لغوی تحقیق کا خمیرہ داخل کر کے نقش مضمون کو لغو بنا دیا ہے اور ایسی فاش اور فاحش غلطیاں کیں جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ہم اپنے اس تاثر کی تائید میں ان دونوں کتابوں سے چند مثالیں پیش کر رہے ہیں۔اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ وہ قرآن کی آیات سے کس طرح نئے معنی دریافت کرتے ہیں۔

سورہ نمل: جن وطیر کی پرویزی لغوی تحقیق

مفہوم القرآن میں ایک جگہ جناب غلام احمد پرویز نے سورہ نمل کے ان مقامات کی تشریح کی ہے جن میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات زیر بحث ہیں۔

قرآن اس کو اس طرح بیان کرتا ہے:

وحشر لسلیمٰن جنوده من الجن والانس والطیر فهم یوزعون O (النمل:۱۷)

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے سارا لشکر اکٹھا کیا گیا جس میں جن بھی تھے، انسان بھی تھے اور پرندے بھی تھے۔ اب اس آیت میں استعمال ہونے والا لفظ ''جن'' عربی زبان کا معروف لفظ ہے۔ یہ اردو زبان کا بھی معروف لفظ ہے۔ اسی طرح لفظ ''انس'' عربی کا معروف لفظ ہے جو اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ انس و جان کے علاوہ ''طیر'' بھی اردو میں استعمال ہوتا ہے اور عربی میں بھی۔ پرویز صاحب کے لیے یہ تسلیم کرنا تو آسان تھا کہ ''انس'' کا مطلب آدمی ہے اس لیے کہ اس دنیا میں آدمی تو بہرحال پائے جاتے ہیں لیکن یہ بات کہ جن اور پرندے بھی حضرت سلیمان علیہ والسلام کے لشکر میں شامل تھے، ان کے لیے ماننا آسان نہیں تھا۔ اس مسئلے کا حل انھوں نے یہ دریافت کیا کہ ''جن'' اور ''طیر'' دونوں کو اس طرح تختۂ مشق بنایا جیسے ہم نے گزشتہ صفحات میں شوربے کی مثال پیش کی ہے۔

جن کے معنی: پرویز

''جن'' عربی کا معروف لفظ ہے۔ اگر کوئی آدمی اس پر تحقیق کرے تو یہ کہے گا کہ جنوں کو جن اس لیے کہتے ہیں کہ عربی میں جن، جنا، جنون کے معنی ہیں چھپا ہوا۔ یہ چونکہ نظر نہیں آتے اس وجہ سے ان کو جن کہا جاتا ہے ایک دوسرا محقق داد تحقیق دیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ جنہ کے معنی ہوتے ہیں ''چھپا ہوا'' لہٰذا چھپی ہوئی مخلوق سے مراد صحرا کے باشندے بھی ہو سکتے ہیں۔ (لغات القرآن جلد اول ص ۴۴۷)

پرویز صاحب چونکہ ''جن'' کو ''انس'' کی طرح الگ سے کوئی مخلوق ماننے پر آمادہ نہیں، اس لیے انھوں نے لغت کو سامنے رکھتے ہوئے جنوں کو صحرا کے باشندے بنایا۔ اسی اصول کا اطلاق انھوں نے ''طیر'' پر بھی کیا، لیکن وہاں معاملہ کچھ الجھ گیا۔

طیر عربی لغت میں گھوڑوں کے لیے نہیں:

''طیر'' عربی زبان میں اتنا معروف اور عام استعمال ہونے والا لفظ ہے کہ کوئی دوسرا لفظ تلاش کرنا شاید مشکل ہو جائے۔ چونکہ وہ یہ مان کر دینے کے لیے تیار نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں پرندے بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے انھوں نے اس معروف معنی سے انحراف کی جو کوشش کی وہ علم کی دنیا میں ایک عجوبہ ہے۔ لفظ ''طیر'' کی تحقیق کے ضمن میں اس کے مختلف مفاہیم بیان کرتے ہوئے وہ ''لغات القرآن'' میں لکھتے ہیں:

> فرس، مطار، طیّار ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔ سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر جن، انس، طیر پر مشتمل تھے۔ ''جن'' سے مراد وحشی قبائل ہیں ''انس'' مہذب آبادیاں اور طیر تیز رفتار گھوڑے۔ (لغات

القرآن ج ۳ ص ۱۱۰۵)

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ مفہوم کہاں سے برآمد ہوا۔ عربی زبان کی تمام لغتوں میں اگر اس کے تمام استعمال کو دیکھا جائے تو ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ طیر گھوڑے کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ ہم یہ جملہ کہہ سکتے ہیں ''یہ گھوڑا کیا ہے؟ یہ تو اڑتا ہوا پرندہ ہے'' یہاں جملہ خود بتا رہا ہے کہ گھوڑے کے لیے مجازاً پرندے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ زبان و بیان کا ایک عام اسلوب ہے، لیکن اگر قرینہ موجود ہی نہیں ہے تو پھر ''طیر'' کے معنی پرندے ہی کے ہوں گے۔ پرویز صاحب نے مثال دی ''فرس''، ''طیار''، یعنی تیز رفتار گھوڑا۔ اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جب فرس کا لفظ بولا جائے گا اور ساتھ طیار بولا جائے گا تو یہ معنی اس میں پیدا ہو جائیں گے لیکن یہ معنی مجازاً پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم مجازی مفہوم میں جہاز کو طیارہ کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جب لفظ ''طیر'' ان سارے قرینوں سے بالاتر ہو کر آئے گا یعنی اس کے ساتھ فرس نہیں لکھا گیا تو اس کے معنی گھوڑے کے کیسے ہو جائیں گے؟ وہ تو پرندہ ہی رہے گا۔

تیز رفتار گھوڑے قبیلہ طیر کے شہسوار ہو گئے:

معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کو بعد میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دور از کار تاویل ہے تو انھوں نے ''مفہوم القرآن'' میں اس کو مختلف انداز سے بیان کیا۔ یہاں انھوں نے لکھا:

> سلیمان علیہ السلام کے لشکروں میں شہروں کے مہذب باشندے، جنگوں اور پہاڑوں کے دیوہیکل وحشی اور قبیلہ طیر کے شاہ سوار سب شامل تھے۔ (مفہوم القرآن ج ۲، ص ۸۶۴)

گویا ''لغات القرآن'' سے ''مفہوم القرآن'' تک آتے آتے تیز رفتار گھوڑے قبیلہ طیر کے شاہسواروں میں تبدیل ہو گئے۔ اگر پہلا مفہوم لیا جائے تو غرابت محسوس ہوتی ہے اس لیے یہاں انھوں نے یہ ترجمہ کر دیا۔ اب اس تاویل پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

کیا قواعد عربی کے تحت الطیر قبیلہ ہو سکتا ہے؟

یہ ''قبیلہ الطیر'' کیا چیز ہے؟ کسی قبیلے کا نام قرآن کو لینا ہو تو کیا اس کا یہی طریقہ ہے؟ یعنی ''الطیر'' کہہ دیا جائے کہ ساری دنیا اس مصیبت میں پڑی رہے کہ ''پرندے'' ہیں اور اس سے اصلاً مراد ہو قبیلہ۔ اگر کسی قبیلے کا نام ''الطیر'' ہو تو اس کے لیے بھی زبان اور بیان کا ایک قرینہ ہوگا شواہد ہوں گے، زبان اور بیان کے قواعد میں وہ چیز موجود ہوگی کہ اس کو جان لیا جائے۔ قرآن مجید میں صحرا کے باشندوں، جنگل میں رہنے والوں کے لیے معروف لفظ ''اعراب'' استعمال ہوا ہے۔ فرض کریں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ لشکر میں یہ لوگ تھے تو قرآن نے جہاں صحرا کے باشندوں کا ذکر کیا ہے تو کہا ہے ''**وقالت الاعراب امنا**'' اعراب ایک معروف لفظ ہے۔ اب ایک معروف لفظ کو چھوڑ کر قرآن نے ایک نیا لفظ

استعمال کیا جن، جس سے نہ عربی زبان واقف تھی نہ عرب واقف تھے۔ گویا کسی طرح بھی یہ تاویل اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں ''جب یہ سب لشکر تیار ہو گئے حتی اذا اتوا علی و ادا النمل یہاں تک کہ وہ وادی نمل میں آئے۔

وادی نمل کی سربراہ عورت تھی:

نمل عربی زبان کا معروف لفظ ہے جو چونٹیوں کے لیے بولتے ہیں۔ یعنی مطلب ہوگا کہ چیونٹیوں کی وادی میں آئے۔ یہ قرآن مجید کا مشہور مقام ہے لوگ اسے جانتے بھی ہیں لیکن پرویز صاحب کے لیے یہ بڑا مشکل مقام ہے جو آگے بات بیان ہوئی ہے وہ یہ کہ وہاں چیونٹی نے گفتگو کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے سن لی۔ ان کے لیے یہ ماننا بہت مشکل کام ہے۔ وہ اپنے ذوق کے تحت اس کو نہیں ماننا چاہتے۔ اس لیے انھوں نے جو راستہ اختیار کیا، وہ بہت دلچسپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ والسلام کو معلوم ہوا کہ سبا کی مملکت ان کے خلاف سرکشی کا ارادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ بطور حفظ ماتقدم اس کی طرف لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ راستے میں وادی نمل پڑتی تھی۔ ملکہ سبا کی طرح اس مملکت کی سربراہ بھی ایک عورت تھی۔ جب اس نے اس لشکر کی آمد کی خبر سنی تو اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں جا کر پناہ گزیں ہو جائیں۔ (مفہوم القرآن ج ۲، ص ۸۶۴)

قرآن نے ملکہ نمل کے لیے نملیۃ کے بجائے نمل کیوں استعمال کیا؟

یہاں ان کے نزدیک نملہ ایک عورت کا نام ہے جو وادی نمل کی تھی۔ اب دیکھیے یہ تسلیم کرنے سے کیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے کہا قالت نملة نمل اسم جنس ہے۔ نملہ چیونٹی کو کہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ عورت اس قبیلے کی سربراہ تھی تو عربی کے کس قاعدے کی رو سے یہ نکرہ استعمال ہو سکتا ہے۔ اسے ایک نملہ (A Namla) تو نہیں کہہ سکتے "The Namla" ہی کہیں گے۔ لیکن قرآن میں تو یہاں قالت نملۃ ہے یعنی نکرہ استعمال ہوا ہے۔ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ نملہ اس کا نام تھا یہ بات تو نمل سے معلوم ہوتی ہے جو صحیح نہیں کیونکہ یہ عربی زبان کے معروف استعمال کے خلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی عورت قبیلہ اوس کی ہو تو اس کو عربی میں کیا کہیں گے؟ اوسہ یا اوسیہ اگر کوئی قبیلہ بنی عبدالشمس کی ہو تو کیا کہیں گے؟ عبدالشمسیہ کہیں گے کہ عبدالشمسہ؟ یعنی اگر فرض کیجیے کہ قرآن مجید کو یہاں کہنا ہوتا کہ ''قبیلہ نمل کی عورت'' تو قرآن کہتا قالت نملیۃ جب آپ پاکستانی بولیں گے تو نسبت کے لیے ''ی'' لگائیں گے، اس کے بعد لفظ میں یہ مفہوم پیدا ہوگا۔

زبان کے مسلمہ اصول پامال کر دیے گئے:

پرویز صاحب نے ان سب چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو زبان کے مسلمہ اصول ہیں۔ ان

سب کو نظر انداز کر کے فرمایا ''ان کی سربراہ بھی ایک عورت تھی'' اور اس کا نام اس لیے نملہ آیا کہ وہ قبیلہ نمل سے تعلق رکھتی تھی۔ یعنی یہاں اگر فرض کر لیجیے کہ اس کو قبیلہ نمل کی عورت کے معنی میں لیں تو یہ کہا جائے گا کہ ایک عورت نے کہا **قالت نملة** اگر اس کو ان معنوں میں لینا چاہیں تو عربی زبان کی رو سے یہ ضروری ہوگا کہ قالت نملیۃ کہا جائے گویا علاقے سے نسبت کریں یا قبیلے سے بہر حال اسی طرح بولیں گے۔ اب اسی سورہ میں پہلے ذکر ہوا کہ **علمنا منطق الطیر** یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اوپر اللہ کا یہ احسان بیان کیا ہے کہ ہم کو پرندوں کی زبان سکھائی گئی۔ منطق معروف لفظ ہے۔ طیر بھی معروف لفظ ہے۔ پرویز صاحب کے لیے یہ ماننا مشکل ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی زبان سکھائی گئی ان کے نزدیک طیر سے مراد ہے گھوڑوں کا لشکر اور **علمنا منطق الطیر** سے مراد ہے گھوڑوں کے لشکر کو سدھانے اور استعمال میں لانے کے قواعد اور ضوابط اللہ تعالیٰ نے ہم کو سکھائے (مفہوم القرآن ج ۲، ص ۸۶۳) سوال یہ ہے کہ عربی زبان کا کوئی جاننے والا لفظ منطق کو اس معنی میں بولے گا، طیر کو اس معنی میں بولے گا۔ اس کا کوئی امکان نہ اردو میں ہے نہ عربی میں۔

ملکہ سباء کا تخت پایہ تخت بن گیا:

اس کے بعد دیکھیے کہ جہاں پر ملکہ سبا کا تخت لانے کا ذکر ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا **قال یایھا الملوا ایکم یاتنیبعر شھا** یعنی مجھے کون اس کا تخت لا کر دے گا سادہ ترجمہ ہے۔ اس کے سوا لفظوں کا مفہوم وہ بھی کوئی اور نہیں کر سکے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اصل میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ مجھے اس کے پایہ تخت کو کون فتح کر کے دے گا؟ اگر یہ جملے کا سیاق وسباق، زبان کے قواعد اور استعمالات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہاں بھی اس مفہوم کو اختیار کرنا ممکن نہیں۔

پرویز صاحب منطق عقل لغت سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں وہ بھی غلط:

اب اگر بعد کے واقعات کو بھی دیکھا جائے جن میں ملکہ بلقیس کے تخت کو لانے، اس کے مفتوح ہونے اور ایک کتاب کا علم رکھنے والے صاحب کا ذکر ہے جنھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا، وہ پلک جھپکنے تک ملکہ کے تخت کو ان کے حضور میں پیش کر دیں گے، تو عجیب وغریب صورت حال پیش آتی ہے۔ چونکہ پرویز صاحب اس طرح کی کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں اس لیے وہ ان مقامات پر بھی عربی زبان اور قرآن مجید کے الفاظ کو تختۂ مشق بناتے ہیں اور وہ مفہوم برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو متکلم کے پیش نظر نہیں تھا۔ قرآن مجید کے ایک سچے طالب علم کا رویہ تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ قرآن مجید کو خالی الذہن ہو کر پڑھے اور اس پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، اسے قبول کرتا جائے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے غور وفکر کی دعوت دی ہے لیکن یہ غور وفکر کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند ہونا چاہیے۔ اگر ہم قرآن کے الفاظ اس کے اسالیب اور ہر چیز کو نظر انداز کر کے، اس سے وہ خیالات برآمد کرنا چاہیں جو ہمیں پسند ہیں تو منطق اور عقل کے ہر پیمانے سے یہ تحریف کہلائے گی۔ سورہ نمل کے ساتھ جو سلوک پرویز

صاحب نے کیا وہ دراصل ان کی قرآن فہمی کی ایک مثال ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کو کیا سمجھتے ہیں اور انھیں کتاب اللہ کا کتنا احترام ہے اور اپنے خیالات کے سامنے قرآن کو کس مقام پر رکھتے ہیں؟ اگرچہ یہی مثال پرویز صاحب کے فہم قرآن کے اصول سمجھنے کے لیے کافی ہے لیکن اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کے لیے ہم قرآن کا ایک اور مقام دیکھتے ہیں۔

سورہ تکویر قرآن مجید کی معروف سورہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ انسان کو خبر کے انداز میں اس طرح مخاطب کرتے ہیں:

اذا الشمس کورت o و اذا النجوم انکدرت o واذا الجبال سیرت o و اذا العشار عطلت o واذا الوحوش حشرت o واذا البحار سبحرت o واذا النفوس زوجت o و اذا المودۃ سئلت o بای ذنب قتلت o واذا الصحف نشرت o واذا السماء کشطت o واذا الجحیم سیرت o واذا الجنۃ ازلفت o علمت نفس مئآ احضرت o

جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور تارے بے نور ہو جائیں گے پہاڑ چلا دیئے جائیں گے اور دس ماہہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکھٹے ہو جائیں گے اور سمندر ابل پڑیں گے جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی! جب کہ اعمال نامے کھولے جائیں گے اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی۔ تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے۔

اس سورہ میں قیامت کے اس زلزلے کا ذکر ہے جس میں پہاڑ اپنی جگہ سے چل پڑیں گے۔ ستارے اپنے مقام سے گر پڑیں گے۔ سورج پر تیرگی چھا جائے گی۔ اس میں وہ آیت بھی آتی ہے جو قرآن مجید کے اسلوب کا شاہکار ہے کہ زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس گناہ میں قتل کیا گیا۔ کیونکہ عرب لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے۔ اس کے لیے ''مودۃ'' کا لفظ کلام عرب میں اتنا عام لفظ ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اب ذرا دیکھیے کہ پرویز صاحب ان آیات کا مفہوم کس طرح بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

سورہ تکویر کی غلط سلط ترجمانی:

> کسی آنے والے دور میں جب انسانوں کے خود ساختہ نظامِ تمدن و معاشرت کی جگہ قرآنی نظام لے لے گا تو اس وقت کی انقلابی کیفیات سے متعلق یوں سمجھو کہ

ملوکیت کا نظام لپیٹ دیا جائے گا اور ان کے اہالی موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب جھڑ کر نیچے گر جائیں گی۔ ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی اور پہاڑوں جیسے محکم امرا و رؤسا اپنی اپنی جگہ سے ہل جائیں گے اور جن ذرائع رسل و رسائل (مثلاً اونٹوں) کو اس وقت اتنی اہمیت دی جا رہی ہے، وہ سب بے کار ہو جائیں گے اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کی طرف آتی جائیں گی اور سمندروں میں آمد و رفت کا سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ ہر وقت بھرے بھرے دکھائی دیں گے اور ان کے کناروں کی بستیاں بھی بڑی آباد ہو جائیں گی اور اطراف و اکناف کی آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جائیں گی۔ جب ان لڑکیوں کے متعلق جنھیں معاشرہ زندہ درگور کر دیتا ہے اور ان بے چاریوں کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوتا، پوچھا جائے گا کہ انھیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جاتا رہا (یعنی عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں گے) اور اخبارات و رسائل جگہ جگہ پھیل جائیں گے اور اجرامِ فلکی پر پڑے ہوئے پردے ایک ایک کر کے اٹھے چلے جائیں گے (ان کے حالات دریافت کیے جائیں گے۔) تو اس وقت خدا کے قانونِ مکافات کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس وقت آخرالامر وہ نظام متشکل ہو جائے گا جس میں ہر معاملہ انصاف اور قانون کے مطابق طے پائے گا لہٰذا اس کی رو سے) مجرمین کے لیے جہنم کے شعلے زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھیں گے اور اس نظام کی پابندی کرنے والوں کے لیے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا یعنی اس وقت ہر شخص اپنے اپنے عمل کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھے گا۔ (مفہوم القرآن ج ۳، ص ۱۴۱۸، ۱۴۱۹) جدیدیت سے مرعوبیت کا عالم دیکھیے کہ ایام عرب میں زندہ درگور لڑکی کے ذریعے تحریک آزادی نسواں کا ذکر آ گیا۔ سمندری تجارت کے ضمن میں مغربی اقوام کی قزاقی کی سند آ گئی۔ ذرائع ابلاغ کے مغربی انقلاب کے نتائج عہد رسالت میں نازل ہونے والی آیتوں میں داخل کر دیے گئے۔]

اس مفہوم میں زبان کے عرف، سیاق، الفاظ کے واضح مدلولات، تشبیہ و تمثیل کے طریقوں کو جن میں دوسری رائے ممکن نہیں تلپٹ کر کے عہد جدید میں پہنچا دیا گیا ہے۔

پرویز صاحب کے طریقے پر سورہ نمل کی تشریح:

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکہ سبا کو شکست دے دی اور وہ سارے معاملات

ہو گئے۔اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں وہ آئیں۔ پرویز صاحب کے نزدیک اس سے پہلے تک سب کچھ تمثیل تھی یعنی اس میں مجازی مفہوم تھے ''تخت'' سے مراد ''پایہ تخت'' تھا اس کو لانے سے مراد اس کو فتح کرنا تھا۔اس کے بعد **قیل لھا ادخلی الصرح** جب وہ آئیں تو ان سے کہا گیا کہ آپ ذرا شیش محل میں داخل ہو جایے۔

فلما رأته حسبته لجة و کشفت عن ساقیھا جب انھوں نے اس کو دیکھا کہ یہ تو پانی موجیں مار رہا ہے تو انھوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھالیا **قال انه صرح ممرد من قوارير** تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا نہیں یہ تو اصل میں شیشہ لگا ہوا ہے اور بہت صفائی سے لگا ہوا ہے۔ یہ مشہور واقعہ ہے اس میں پرویز صاحب کو کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تو انھوں نے اس کا بالکل وہی مفہوم بیان کیا جو ہم نے بیان کیا ہے یہاں نہ مجاز ہے نہ تمثیل اگر انہی کے اصول پر اس کی تشریح کی جائے تو یہ کہا جائے گا ''جب وہ آئیں تو ان سے کہا گیا کہ آپ اپنی تمناؤں اور آرزؤں کے شیش محل میں داخل ہو جایے جب وہ اس میں داخل ہوئیں اور انھوں نے اس کو دیکھا پھر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں پر اک نگاہ ڈالی تو انھوں نے خیال کیا کہ یہ تو اصل میں سراب ہی ہے۔اس وقت وہ بیچاری اپنی تمناؤں سے پیچھے ہٹنے کے لیے فوراً اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بالکل مستعد ہو گئیں (یہ عربی کا محاورہ ہے ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے) تو سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے درحقیقت تمنائیں شیشے کا محل ہی تو تھیں جن میں تم زندگی بسر کر رہی تھیں''۔

پرویز صاحب کا طریقہ امت کی مسلمہ علمی روایت نہیں ہے:

یہ پرویز صاحب کے ترجمے اور تفسیر کا انداز ہے اس بنیاد پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اب دو باتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ زبان اور اس کے اسالیب، اس کے مفہوم کو طے کرنے کے طریقوں سے ناواقف محض ہیں یا یہ ہے کہ وہ ان حقائق کو جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں ماننا نہیں چاہتے چنانچہ جہاں جہاں وہ ماننا نہیں چاہتے وہاں انھوں نے تمثیل، تشبیہ اور عرف کے یہ اصول اختیار کر کے قرآن کی وہ تشریح کی ہے جس کی تصویر سورہ تکویر کے مفہوم کی صورت میں پیش کی گئی ہے اور جہاں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی وہاں محل بھی شیشے کا ہے وہاں ملکہ سبا آئی بھی ہیں وہ آ کر اس شیشے پر کھڑی بھی ہوئی ہیں انھوں نے سب کام کیے ہیں یعنی وہاں حقیقت اپنی جگہ موجود ہے حالانکہ ان کے اصول پر اس کی بھی بہت اعلیٰ تاویل ہو سکتی ہے اس کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ بنیادی اور اصولی چیز ہے جس کی وجہ سے ہم پرویز صاحب کے سارے نقطہ نظر ہی کو گمراہی سمجھتے ہیں۔قرآن فہمی کے باب میں یہ اتنی بنیادی اور بڑی غلطی ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز اپنی جگہ پر باقی نہیں رہتی۔اس لیے پرویز صاحب کی فکر کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ وہ دین کو سمجھنے کا ایک زاویہ ہے، جیسے اس سے قبل امت میں مختلف نقطۂ ہائے نظر رہے ہیں۔ پرویز صاحب کی تعبیر نہ تو علمی ہے اور نہ ہی امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہے، اس لیے اسے اس روایت سے الگ کر کے دیکھنا پڑے گا، جسے ہم امت کی علمی روایت کہتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں پرویز صاحب کا طرز علمی روایت کے بجائے جہالت کے

سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اسی کا نام جدیدیت ماڈرن ازم ہے جو صرف عقلیت کو حجت سمجھتی ہے۔ عقل کو اساسِ دین، ماخذ دین اور منبع دین قرار دیتی ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔

پرویز صاحب پہلے منکرین حدیث کے خلاف تھے:

ایک زمانہ جناب غلام احمد پرویز صاحب کا وہ بھی تھا جب وہ معارف صدق ترجمان القرآن میں منکرین حدیث اور وحدت ادیان کے قائلین کے خلاف قلمی جہاد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ نیاز فتح پوری جیسے ملحد اور ابوالکلام آزادؒ جیسے راسخ العقیدہ عالم پر بھی تند و تیز حملوں میں مصروف تھے لیکن اچانک وہ خود منکرین حدیث کے زمرے میں داخل ہو گئے لیکن کبھی اس کایا کلپ کے اسباب بیان نہیں کیے۔ مدیر صدق کے نام اس عہد کا یہ خط بہت سے رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔

پرویز صاحب پہلے منکرین حدیث کے خلاف تھے:

پرویز صاحب کا خط ماجدؒ دریا آبادی کے نام:

''مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے مضمون کو توجہ سے دیکھا اور مشکور ہوں کہ اس کی خامیوں سے اطلاع فرمائی۔ لیکن چونکہ آپ نے بڑے اختصار سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس لیے میں اچھی طرح سے سمجھ نہیں سکا۔ یہ درست ہے کہ قرآن کی ہر ہر آیت تواتر سے مجھ تک پہنچی ہے اور تمام احادیث اس طرح نہیں پہنچی ہیں لیکن ایسی احادیث کو تو بہرحال ماننا پڑے گا، جو تواتر سے ہم تک پہنچی ہیں اور اگر ایسی کوئی بھی حدیث نہ تسلیم کی جائے تو گویا منکرینِ حدیث کے سب سے قوی اعتراض کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ارسطو نے صحتِ اخبار کے لیے جو چھ سات اسناد تجویز کی ہیں، ان میں تعامل بھی شامل ہے۔ تعامل نام ہے اس عمل کا جو تواتر پر مبنی ہو اور اگر ہم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے فریضوں میں احادیث پر عمل کر رہے ہیں تو یہ احادیث (عملِ رسول اکرمؐ) ہم تک تواتر ہی سے تو پہنچی ہیں۔ ایسی احادیث کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت بالکل دینی ہے نہ کہ محض تاریخی، جیسا کہ منکرینِ حدیث کا خیال ہے، یہ تھا میرا مافی الضمیر جو میں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اب آپ فرمائیں کہ اس استدلال میں کمزوری ہے یا خوبیاں ہیں''۔

پرویز صاحب کے اس خط پر ماجد صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

اور پھر سوچیے کہ یہ تحریر کس کی ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ معتقد حدیث کے کسی زبردست ماننے والے ہی کی ہو سکتی ہے۔ اب اس کے بعد نام سن لیجیے۔ خود جناب پرویز کی ہے، اس زمانہ کی جب وہ دہلی میں قیام فرما رہے تھے اور سچ [سابق صدق] اور معارف میں برابر مضمون نگاری سنت و حدیث کی نصرت و حمایت میں کرتے رہتے تھے، یہ ایک نجی خط کی نقل ہے جس پر تاریخ ۵/اپریل ۱۹۳۲ء پڑی ہوئی ہے اور چونکہ اس عبارت میں کوئی بات نج کی نہیں، اس لیے پرویز صاحب معاف فرمائیں کہ اس کے شائع کر دینے میں ان کی اجازت کا انتظار چنداں ضروری خیال نہ کیا گیا۔ (۲۲/فروری ۱۹۶۳ء)